بحکم خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of
The University of Jammu & Kashmir
June 1, 1957

19210
30.XI.60

مطبوعات بیت الحکمت۔ دہلی (ہند) (۲)

اعلانِ انقلاب

وحیٔ اوّل کا انقلابی پیغام

محمد اجمل خاں

قرآن کریم کا انقلابی طرزِ خطاب

ہر مفکر سوچنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نثر سے پہلے شعر وجود میں آیا ہے۔ شعر میں احساسات و جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فنکار خواہ وہ مصوّر ہو یا شاعر، مغنّی ہو یا مہندس و بت تراش، اپنے لطیف جذبات کی تخلیق میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دوسرے بھی خود اُس کی طرح متاثر ہوں۔ اس تخلیق میں نثر کی سی خشک منطق اور محض دماغ کی کارفرمائی نہیں ہوتی شعر میں دل حاکم ہوتا ہے اور دماغ محکوم، اور "معنیٰ" یعنی احساس دل، روحانیت کے افق سے طلوع ہو کر الفاظ و استدلال دماغ کی "صورت" کو اپنے نور سے معمور کر دیتا ہے۔

یہ حسین تخلیق اگر نثر کی شکل میں جلوہ فرما ہو تو اُسے خطابت کہتے ہیں اس میں عقلی دلائل شاعرانہ معنویت کے ذریعے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ لیکن اگر نثر کو محض منطق و عقل کا لباس پہنا دیا جائے تو اس میں شعر و خطابت کی سی اثر آفرینی نہیں رہتی۔

قرآنی طرزِ بیان میں نہ تو شاعری کی سی محض معنویت ہے نہ نثر کی سی محض کرخت منطق۔ اس میں مخاطب کے افکار و ماحول کے مطابق وہ جادو بیانی ہے کہ دل و دماغ دونوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ یہی اس کے الہامی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس طرزِ بیان نے دنیائے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی نثر کو نظم اور نظم کو نثر کے پیرایہ میں لا کر دلوں میں جوشِ نمودِ حیات بھر دیا۔ بہ الفاظِ دیگر عقل و ہوش کی تیرگی کو محبت و شوق کی تابانی سے پُرنور کر دیا۔

وقال اللہ لا تتخذوا الٰهین اثنین انما هو الٰهٌ واحد (النحل)
خدا نے فرمایا ہے کہ یزداں و اہرمن دونوں کو معبود نہ مانو۔ اللہ تو ایک ہی ہے

اعلانِ انقلاب

محمد اجمل خاں

پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۵۲ء (۱۳۷۲ سنہ ہجری)

جملہ حقوق اشاعت و ترجمہ بحق سیف الاسلام خاں جامعی
ممالک ہند و پاکستان و برما و سیلون محفوظ ہیں

Allama Iqbal Library
19210

زیر نگرانی محمد ذوالفقار حسن فاروقی یونین پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپی
اور
بیت الحکمت دہلی (ہند) کی طرف سے سیف الاسلام خاں جامعی نے شائع کی

سول ایجنٹ در ہند: سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی (ہند)
سول ایجنٹ در پاکستان: مکتبہ بیت الحکمۃ۔ اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)
قیمت ایک روپیہ

ST/8
19210
30-XI-60

فہرست مضامین

اعلان انقلاب یعنی سورۃ العلق

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم (قرآن)

اے اللہ ہم تیری پناہ میں آنا چاہتے ہیں اور شیطان رجیم سے بچنا چاہتے ہیں

اوم : وشوانی دیو سوترا دریتانی

اوم اے خدائے کائنات سب برائیوں کو

پراسوا۔ ید بھدرم تنہ آسوا (رگ وید)

پرے کردے۔ جو کچھ بھی بھلائیاں ہیں وہ ہم پر نازل کر

اہرمن دور باش

اہورامزدا نزدیک شو

ازوَنْ دیو دات (شیطان کو دور کرنے کی دعا)

یعنی وندیداد

مقصدِ انسان

تادل، وجود خویش برکندہ نہ ٭ دربند خودی، خدائے را بندہ نہ
گیرم، نہ توجانی وجہاں زندہ بتست ٭ تازندہ بجانان نشوی زندہ نہ

(جامیؒ)

مقصد [illegible]نسان، انسانیت کو ترقی دینا ہے۔ انسان کو اُنس و محبت کا پتلا بننے کے لئے رب [illegible]رم کا حقیقی بندہ بننا چاہیئے۔ اور حق، حسن وخیر کے تصورات کو تصورات عد[illegible] مساوات واخوت میں دیکھنا چاہیئے۔ سورۃ العلق میں انھیں کرم سے تعبیر کیا گیا ہے [illegible] در کریمی مروت وجوانمردی کو اشرف ترین خلق بتایا ہے۔

انسانیت [illegible]کا خوف وحزن صرف محبت الٰہی سے دور ہوسکتا ہے اس کی مجازی صورت محبت [illegible]انی یا انسانیت میں مضمر ہے۔ جیسے چین میں خوش اخلاقی، عرب میں مروت اور ہند میں اہنسا یا رحم کہتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے دنیا میں حق، حسن، خیر، عدل مساوات واخوت عام ہوسکتی ہے۔

انسانیت کے کتابی تصور کو چلانے کے لئے سیاسی اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے اس اقتدار کے حاصل کرنے والوں کی جماعت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاتھ اپنی جانیں بیچ ڈالیں اور دنیا سے بہیمیت، شیطنت' یا بدی کو مٹانے کے لئے جہاد شروع کردیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ ان کا مقصدِ جہاد برائی کا استیصال ہے۔ بروں کا مٹانا نہیں ہے۔ یعنی ان کا جہاد بروں کی اصلاح کے لئے ہے۔ اس میں خودغرضی وخودی کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ اگر چند مظلوم اپنے اندھے پن سے مجبور ہوں، تو انھیں بجبر ظلم وجہل سے نجات دلانا ہر مجاہد کا فرض ہوجاتا ہے اور انھیں بتلانا پڑتا ہے کہ کتابی آمریت مذکورہ بالا۔۔ اصولوں پر قائم ہے

اسلام

"اگر ہم یورپ کو دین اسلام کی طرف بلانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے ہم یورپ کو یہ یقین دلائیں کہ خود ہم (سچے) مسلمان نہیں ہیں۔ یورپ والے ہمیں قرآن کی روشنی میں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہاتھ کی انگلیوں کے اندر سے کوئی چہرہ دیکھا جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے نام لیوا جہل و نفاق اور کاہلی میں مبتلا ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ واقعی اگر یہ کتاب ایک اصلاح کرنے والی کتاب ہے تو اس کے ماننے والے اس قدر ابتر و پراگندہ کیوں ہیں"۔

(وحی محمدی ص۱۳۔ از علامہ رشید رضا۔ ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی)

قرآن دانی کیا ہے؟

"قرآن کے سمجھنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کا ترجمہ پڑھ لیا جائے اور اس کے قصے بیان کر دئے جائیں۔ قرآن سمجھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ یورپ نے ہماری اسلامی سلطنتوں کو تباہ کر دیا، اب اُسے یہ یقین دلانا آسان نہیں ہے کہ قرآن کا قانون چل سکتا ہے۔ ہمارا عالم قرآن جانتا تو یہ ہے کہ قرآن خدا کا قانون ہے، اور عملی طور یہ مانتا یہ ہے کہ انسانی قانون اس کے اوپر ہے"۔

(امالی عبیدیہ ص۲۵۸)

زندہ فکر: جس فکر میں زندگی پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے وہ مردہ ہے اس کے پڑھنے پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف قرآن کا فکر ہی ایک زندہ فکر ہے۔ (امالیٔ عبیدیہ ص ۲۷۸)

سنت کیا ہے؟

سنت یعنی عمل رسول، قرآن کے عالمگیر قانون سے مستنبط ہے۔ قرآنی اصول نا قابل تبدیل ہیں۔ لیکن قرآن کے اصول کی عمومیت جب کسی خاص قوم کے اعمال کا جامہ پہنتی ہے تو اس کے احوال کے مطابق یہ عمومیت ایک خصوصیت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور ہر قوم و زمانے کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ یعنی اصل نہیں بدلتی لیکن فرع کی شکل میں وہ قابل تبدیل ہوتی ہے۔ فقہ اسلام کی اسی لچک نے قانون قرآن (دین۔ قانون۔ صراط۔ طریق) کو ہر زمانے اور ہر حال کے لئے سرچشمۂ ہدایت بنا دیا ہے۔ اسی لئے یہ زندہ اور ترقی کناں فکر ہے۔ لچک نہ ہو، اور جمود و قدامت پرستی پیدا ہو جائے تو کوئی قانون کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

تمہید

اعوذ بِ
اللہ العظیم
من
الشیطان الرجیم

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست
تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است (حافظ)

حدیبیہ کی فتح مبین (۶ھ) کے بعد، رسول عربی صلعم اور ان کے رفیقوں کی کوشش سے دائرہ اسلام میں آنے والے پورے طور پر اسلامی انقلاب کو سمجھ گئے۔ انھوں نے بیعت رضوان کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ دنیا کو جہل و ظلم سے نجات دلانے کے لئے اپنی جان مال کو اللہ کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ اس کے بعد کتابی آمریت نے خیبر سے ابتدا کی اور چار سال کے اندر نہ صرف عربی قومی انقلاب کی تکمیل کردی بلکہ عالمی انقلاب کے لئے پہلے صلح جویانہ خطوط اور پھر اللہ والوں کی فوجوں کے ذریعے بجبر تاریکی کو روشنی سے بدلنے کا عمل شروع کردیا گیا۔ اس کے بعد ۱۱ھ میں خدا پرستی کا پیغام پہنچانے والے ایلچیؐ نے وفات پائی۔ لیکن پیغام دنیا میں باقی رہا اور خلفاء و رفقائے رسولؐ اس پیغام کی رسالت کا کام دنیا میں کرتے رہے اسی لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے انھیں متممین رسالت کا لقب دیا ہے۔ ہمارے خیال

میں یہ سب رسول اللہؐ کے رسول تھے۔ اور جو خدائی پیغام رسول عربیؐ اور دوسرے انبیاء لائے تھے، اس کی بنیادوں پر یعنی رسول عربیؐ کے بتائے ہوئے طریق عمل (سنت فعلی) کی روشنی میں، یہ رفقائے رسول اللہؐ عمل کر رہے تھے۔ غرضکہ جو انقلابی سوسائٹی رسول عربیؐ نے بنائی تھی اُس کی زندگی و حرکت کتابی فکر اور عمل رسول کی پیروی پر منحصر تھی۔ اس انقلابی سوسائٹی کا فکر اس درجہ یقین کے ساتھ عمل سے ہم آہنگ تھا اور اس کی تنظیم ایسے فطری اصولوں پر ہوئی تھی کہ ہر فرد خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سرگرم عمل صحیح تھا۔ یعنی اس سوسائٹی میں بدعملی (فساد فی الارض) ناممکن بنادی گئی تھی۔ اس صحیح فکر یعنی نصب العین انقلاب اور صحیح عمل یعنی طریق کار انقلاب کو سمجھے بغیر روح اسلام کا سمجھنا مشکل ہے۔ یہ دونوں باتیں کتب الٰہیہ اور سنن رُسُل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں بشرطیکہ تقابلی مطالعہ کے لئے کتب شیطانیہ اور عمل اخوان الشیاطین (یعنی یہودیت۔ ساحر۔ کاہن سرمایہ پرست اور دوسرے ذہنی اور جسمانی غلام سازوں یا بہ اصطلاح جدید "رجعت پسندوں" کے اعمال) ہمارے سامنے ہوں۔

۱۔ صحیح فکر: قرآن حکیم نے، کتب الٰہیہ کی الہامی ترجمانی کے ذریعے سے جو وحی متلو پیش کی ہے اُس سے جملہ کتب الٰہیہ کی حکمت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

۲۔ صحیح عمل: صحیح عمل وہ وحی غیر متلو ہے جو کتب و حِکَم الٰہیہ کی پیروی میں رسول عربیؐ نے اپنی نبوی زندگی میں عملاً کرکے دکھا دیا۔ اس سلسلے میں جملہ کتب الٰہیہ قبل قرآن کو سنت نبوی کا درجہ دینا ضروری ہے۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے، ہم نے اسے تاریخی ترتیب سے مرتب کرکے سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں حضرت مولانا عبیداللہ بن اسلام سندھی (سنہ ۱۹۴۴ء) تحریر فرماتے ہیں:۔

"مسلمان قرآن حکیم کو انسانیت کے لئے آخری پیام ربانی مانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اس عقیدے کو آج کی ذہنیت سے

قریب لانے کے لئے قرآن دنیا کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام دیتا ہے اس کا نصب العین .... ھوالذی ارسل ....
رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ....
(اس کی تفسیر ازالۃ الخفاء از امام ولی اللہ کی جلد اول کے ابتدائی صفحات میں ہے)

"پارٹی پروگرام قرآن کی متعدد سُورتوں میں حزب اللہ کے لئے تفصیلی احکام دے کر مکمل کر دیا گیا ہے ....

....

"ان مفکرین کو دوسرے مرحلہ میں ایسی سوسائٹی کی ضرورت محسوس ہوگی جو تمام انقلابی نظریات پر حاوی ہو چکی ہو......
...... اسلامی عقائد و اخلاق اور اسلامی حکومت کی درمیانی کڑی یہی انقلابی سوسائٹی ہے۔ اس کے احکام و نظریات مشتبہ رہنے سے تسلسل فکر قائم نہیں رہتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے مناسب پروگرام بنانے میں قرآن حکیم سے مدد نہیں مل سکتی۔ ہمارے فقہاء گورنمنٹ کے احکام بھی عقائد و اخلاق کی طرح ضبط کر دیتے ہیں، جس سے ایک قسم کا جمود پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اکثر اہل علم اس ساری داستان سے صرف اس قدر یاد رکھتے ہیں کہ زانی کا رجم اور چور کا ہاتھ کاٹنا ضروری ہے.....
.... گورنمنٹ اور سوسائٹی کے احکام ممتاز کرنے کے لئے قرآن عظیم کی مکی اور مدنی سورتوں کا متعین کر لینا ضروری ہے۔

....

"قرآن عظیم کی ہر سورت کے متعلق مفسرین کے پاس روایتیں موجود ہیں .... بعض احکام کی تاریخ ان روایتوں کی تخلیط

کرتی ہے۔ بعض مفسرین اپنے مسلمہ نظریات کی مدد سے ان روایتوں کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ روایتی سلسلہ ناقابل اطمینان ہو گیا ہے۔ ....

....

.... "مولانا محمد اجمل خاں ..... کا ان مفسرین پر ہمیشہ احسان رہے گا انھوں نے اندرونی شہادت کی مدد سے مکی سورتوں کے معین کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور روایات کے اختلاف سے جو اغلاق پیدا ہوا تھا اُسے دور کرنے کی پوری کامیاب کوشش کی ہے۔"

(پیش لفظ: "ترتیب نزول قرآن کریم")

رسول عربیؐ کی سیرت کے ساتھ ساتھ قرآن کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ ہی اسلامی عمل و فکر کو پورے طور پر نمایاں کر سکتا ہے۔ اگر ہم قرآن کو تاریخی ترتیب سے نہ پڑھیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی فکر کے تسلسل اور ترتیب کو دماغ اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا اور عمل نبوی کے متعلق سطحی اور بسا اوقات قیاسی باتیں بنانا پڑتی ہیں۔ اور جب حقیقت نظر نہیں آتی تو فرقہ بندی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زوند

اس اشکال کو دور کرنے کے لئے ہم نے عمل نبویؐ یعنی سیرت سیدنا محمدؐ رسول اللہ کو بھی قرآن کی تاریخی ترتیب کے ساتھ ساتھ مرتب کر لیا ہے جس کے مطالعے سے فکر و عمل نبوی کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہ سکتا۔ اس سیرت کبیر کے خلاصے کا خلاصہ "دہلی سے" "سنگم کتاب گھر" نے شائع کر دیا ہے۔ بہت ممکن ہے اختصار کی وجہ سے سیرت صغیر میں بعض مضامین تشنہ نظر آئیں، لیکن نا مسلمانوں کے لئے اتنی مختصر سیرت ہی کافی ہے جو انھیں حقیقت اسلام، اور اس کی انقلابی روح کے سمجھانے میں معین ہو سکتی ہے۔ لیکن قدامت پرست اصحاب اگر قرآن حکیم اور سیرت رسول کریم میں پیغام و عمل کی ہم آہنگی اور انقلاب آفرینی نہیں پاتے تو سوائے اس کے

کیا کہا جائے کہ قرآنی سیرت تحصیل حاصل ہے یعنی ؎

مرا بسادہ دلیہائے من تواں بخشید　　　خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم (نظیری)

اگر قرآن حکیم کو تاریخی ترتیب یعنی ترتیب نزول کے مطابق پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً یہ زندہ فکر اور پیغام انقلاب ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض لوگ شانِ نزول اور ترتیبِ نزول کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ترتیب نزول قرآنی تعلیم کے پورے سیاق و سباق کو بتاتی ہے اور سیرت نبوی میں قرآن کا تاریخی مقام متعین کرتی ہے۔ شان نزول کا تاریخی ترتیب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سے نزول کے زمانے کا تعین نہیں ہوتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں آیت یا سورت کس کے لئے اور کیوں یا کن احوال و کیفیات میں نازل ہوئی۔ یعنی شان نزول سے "کب" کا جواب نہیں ملتا، "کیوں" کا حل جاتا ہے۔

بالاتفاق "سورۃ العلق" کی پہلی پانچ آیتیں پہلی وحی ہیں، جو مکہ کے قریب جبل حرا پر ۴۱ عام الفیل کے ماہ رمضان میں آنحضرتؐ کے قلب پر روح الامین کے ذریعے سے نازل ہوئیں۔ اس لئے یہ آیتیں "فاتحۃ الکتاب" ہیں۔ اگر مولانا عبیداللہ بن اسلام سندھیؒ نے سورۃ الفتح کا نام عنوان انقلاب نہ رکھ دیا ہوتا تو ہم ان آیتوں کو عنوان انقلاب سے موسوم کرتے۔ بہرحال یہ آیتیں **"عینان انقلاب"** ہیں۔ یعنی وجود اور علم کے متعلق ان آیتوں کی دونوں آنکھوں سے نظر ڈالی جائے تو صرف ایک جواب ملتا ہے کہ وجود و علم کا فیضان صرف ذات واجب الوجود سے ہے۔ ہر جگہ اللہ ہی اللہ ہے۔ یعنی بقول صاحب "گلشن راز" ؎

دلِ یک قطرہ را اگر بہ شگافی　　　بروں آید از و صد بحر صافی

حضرت مُلّا جامی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں کہ جمال وحدت وجود و علم یعنی جمال وحدتِ حقیقی کے عظیم ترین حجاب اور کثیف ترین نقاب تقیدات و تعددات ہیں جو ظاہر وجود میں واقع ہوئے ہیں۔ ذات و صفات کی بحثیں اسی وجہ سے چھڑی ہوئی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

همسایه و همنشین و همره همه اوست
در دلق گدا و اطلس شه همه اوست
در انجمن فرق و نہاں خانۂ جمع
باللہ همه اوست ثم باللہ همه اوست

اسی لئے ہم امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کی روشنی میں مادہ کو بھی شئون الٰہیہ میں سے ایک شان سمجھتے ہیں (کل یوم ھو فی شان) اور جب حقیقت وجود و علم کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی انقلابی شان سامنے لائی جاتی ہے تو عقل و نقل و کشف کا تعدد وحدت فکر و عمل میں بدل جاتا ہے۔

ہم نے اس فاتحۃ الکتاب کا نام "**اعلان انقلاب**" اسی لئے رکھا ہے یہ سب فلسفیانہ بحثوں کا خاتمہ کر کے شکوک و اوہام کی کثرت کو وحدت یقین میں بدل دیتا ہے۔ اور فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کر کے ظلم و نفرت کی دنیا کو عدل و محبت کی جنت بنا دیتا ہے۔ و باللہ التوفیق:

بر اوجِ کمال صبح صادق مائیم
حلّ نکت و کشف دقائق مائیم
سرّ حق و خلق از دل ما بیروں نیست
مجموعۂ مجموع حقائق مائیم

(جامیؒ)

محمد اجمل خاں
۱۴ر اگست سنہ ۱۹۵۲ھ ہندی

بیت الحکمت۔ دہلی۔ ہند
(سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار)

ربّک

الّذی خلق　　　الّذی علّم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعلانِ انقلاب

مفہوم سورۃ الفاتحہ یعنی سورۃ العلق

یک قصہ بیش نیست غم دِ بن عجیب
از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر ست
(حافظؒ)

رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے ۶۱۰ھ میں عرب کی سرزمین میں سوشل اور معاشی انقلاب کی جو بنیادیں قائم کی تھیں، اور ان بنیادوں پر جس عالمی انقلاب کی عمارت بنائی تھی، اس کی ابتدا سورۃ العلق کی پانچ آیتوں سے ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ انقلاب میں یہی اہم ترین آیتیں ہیں۔ یہ عنوان انقلاب ہی اعلانِ انقلاب ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو خوف، بھوک اور ظلم سے نجات ملے اور وہ اپنے رب کو پہچان کر ربانی بن جائے ؎

زآخرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار ست
(غالب)

اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ دنیا میں امن و ترقی کی راہیں کھلیں تو وہ اسلامی فکر (قرآن) اور اسلامی عمل (سیرت نبوی و عمل رفقائے نبوی) کی روشنی میں پھر ویسا ہی عالمی پروگرام بنا سکتی ہے۔ جس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کو امن و ترقی کے راستے پر لگایا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جماعت کے پاس فکر و عمل کا ایسا عظیم الشان خزانہ موجود تھا وہ خود ذہنی و عملی طور پر تیس پینتیس سال کے اندر کیوں مفلس و نادار بن گئی؟ ظلم و نفرت کا پھر کیوں دور دورہ ہو گیا، اور ترقی کا راستہ کیوں خطرناک بن گیا!!

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے کتابی فکر و عمل سے لاپروائی برتنا شروع کر دی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارتجاعی قوتیں اسلامی انقلاب پر چھا گئیں۔ اگر حضرات ابوبکر و عمرؓ نہ ہوتے تو قرآن کا حکم چلانے والی جماعت اور جماعت کے ساتھ کتابی حکومت ۱۱ھ ہی میں ختم ہو جاتی۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کے ارتجاع کے اسباب بھی وہی تاریخی و فلسفیانہ اسباب ہیں جو ہر قوم کی واماندگی تباہی اور زوال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) فکر و عمل سے لاپروائی کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ نہ تو قرآن حکیم کی تدوین (۳۰ھ) ترتیب تنزیل کے مطابق کی گئی نہ رسول اللہؐ کا طریق کار یا عمل و سنت رسولؐ تاریخی ترتیب سے قرآن کے ساتھ ساتھ نمایاں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں آنے والوں کے لئے احیائے اسلام و قیام دولت کتابیہ کا تاریخی پروگرام ہی مبہم ہو گیا۔

(۲) دوسری اہم وجہ وہ نومسلم تھے جو اپنے ساتھ اپنے فرسودہ عقائد لائے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فکر و عمل اسلام کے دشمن، یعنی بنو امیہ بکراہت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ کے برسراقتدار آتے ہی مروان بن الحکم کی ریشہ دوانیوں نے بوڑھے نیک دل اور کمزور طبیعت

خلیفہ کے نام پر ہر جگہ ان ہی امویوں کو بر سر اقتدار کر دیا۔ اسی مروان اور اس کے دوستوں (عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط وغیرہ) کی وجہ سے آخر کار حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ اسی نے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو تدوین مصحف عثمانی کی کمیٹی میں شریک نہ ہونے دیا۔ اور آخر کار جب اسے اقتدار حاصل ہوا تو جو قرآن ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس تھا اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے اسے نہیں دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ام المومنینؓ کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ مروان کے دھوکے میں آ گئے۔ وہ مصحف دیکھنے کے بہانے سے لے گیا اور اسے ضائع کر دیا۔

یہ مصحف حضرت زیدؓ بن ثابت نے جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے حکم اور حضرت عمرؓ کے مشورے سے مختلف اوراق میں لکھ لیا تھا۔ یعنی حفاظ قرآن اور مکتوبہ پرچوں کی دوگونہ شہادت کے بعد پورے قرآن کو صحف میں لکھ لیا تھا اس قرآن کے ہر سورہ میں آیات قرآنی کی ترتیب وہی تھی جو رسول اللہؐ نے حکم خداوندی سے دی تھیں۔ لیکن مختلف سورتوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں دی گئی تھی۔ ہر حافظ و قاری جس ترتیب سے چاہتا تھا اور ان سورتوں کو پڑھتا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے تک سورتوں کی کوئی مقررہ ترتیب نہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ جو مہاجر تھے اُن کے پاس مکی قرآن پہلے تھا اور اس کے بعد مدنی قرآن تھا۔ گویا ایک طرح سے ترتیب تنزیل کے مطابق تھا۔ لیکن جب اہل کوفہ و شام کی ترتیب سور میں اختلاف ہوا تو حضرت عثمانؓ نے پہلے کاتب قرآن یعنی حضرت زید بن ثابت ہی کے ذریعے اس مصحف کی نقل کرائی جو بعد شہادت عمرؓ ان کی بیٹی ام المؤمنین حفصہؓ کے پاس تھا۔ اس نقل میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ پہلے لمبی سورتیں (طوال) پھر اوسط درجہ کی سورتیں (مئین) اور پھر مختصر سورتیں (مفصل یعنی جن میں جلدی جلدی فاصلہ دیا گیا تھا) لکھی گئیں۔ اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ وہ اس ترتیب سے لکھی جائیں جس ترتیب سے نازل

ہوئی تھیں۔ البتہ اس کا اہتمام تھا کہ تلفظ الفاظ میں قریش کے تلفظ پر املا کیا جائے اور تین قرشی یعنی عبداللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کے مشورے سے صحیح قرشی تلفظ کے مطابق لکھیں۔

چونکہ ہماری رائے میں قرآن کا ہر رکوع ایک مضبوط و محکم سورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان رکوعوں (پیراگرافوں) کا نزول نجماً نجماً اور ایک خاص تاریخی تسلسل کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لئے بعض سورتوں میں ان رکوعوں کی ترتیب تاریخی نہیں ہے۔ قرآن کی داخلی شہادت سے یہ بات ثابت ہے۔ لہذا ہم یہ تو مانتے ہیں کہ ترتیب آیات فی السور توقیفی ہے۔ لیکن بعض رکوعوں (یعنی مفصل سورتوں) کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ترتیب بھی توقیفی تھی۔ چونکہ موجودہ مصحف یعنی مصحف عثمانی میں مختلف سورتوں کی ایک قرأت یعنی ایک ہی ترتیب قائم کردی گئی۔ اور دوسرے صحابیوں کو مختلف قراتوں (یعنی ترتیبوں) سے روکا گیا۔ اس لئے موجودہ مصحف سے قرآنی تعلیم کی تدریجی تاریخی تعلیم نہیں معلوم ہو سکتی بہر حال روایات موجود ہیں اور قرآن کی داخلی شہادت بھی اس کے لئے کافی ہے کہ قرآن کی کون سی سورۃ کس زمانے اور ماحول میں نازل ہوئی۔ اگر مصحف علیؓ بھی عام ہوا ہوتا تو تفسیر و تاریخ اسلام میں کوئی اشکال نہ ہوتا۔ بہر حال یہ کہنا کہ عجمی مسلمانوں کی وجہ سے فکر و عمل اسلامی میں آمیزش ہوئی، صحیح نہیں ہے۔ اصلی تدلیس اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب سے کہ خود وہ اموی نومسلم دائرۂ اسلام میں آکر برسر اقتدار ہوئے جنھوں نے بیس سال تک یعنی فتح مکہ تک اسلام اور بانیٔ اسلام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

خلافت راشدہ کے بعد، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تدوین قرآن سنہ ۳۰ھ کے بعد ہی بنو امیہ کی سیادت اصلی اسلام پر چھا گئی اور تفاخر نسل و قصاص و نخوت جاہلیہ جسے آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع میں اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا سطح پر آگئی اگرچہ اسلام نے اس خالص عربی ذہنیت کی برائیوں کو ایک حد تک کم اور خوبیوں کو

اُجاگر کردیا ... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق میں خالص عربی یا شافعی فقہ بنی اور عربی دنیا میں پھیل گئی۔

پھر عباسی خلافت کے دور میں عجمی (یعنی غیر عربی یا آرین) تصورات ... قدرتاً زائد ہو گئے۔ یونان و سکندریہ کے فلسفے اور ایران کے زرتشتی و مانوی تصوف نے قانون اسلام کے عربی رنگ پر عجمی رنگ چڑھا دیا جو ... کی شکل میں نمایاں ہوا۔ اور بغداد سے جو مخلوط عربی و عجمی فقہ مامون الرشید کے ... شروع ہوئی تھی وہ عباسی خلافت کے زوال کے بعد بخارا سے غزنیں اور وہاں سے دہلی پہنچ کر خالص عجمی رہ گئی۔

اسی طرح قرآن کی اساسی تعلیم، سنت نبوی کی قومی تعبیروں سے گزرتی ہوئی مختلف ملکوں میں پہنچی اور نئے نئے لباسوں میں ظاہر ہوئی۔ ان لباسوں میں اگرچہ قرآن کی اساسی ... باقی نہ رہی، لیکن قرآنی اصولوں کی قوت ... بہت بڑا اثر باقی رہا۔ اس اثر کو جب مسلمانوں نے اپنی بے عملی سے بالکل ... دیا تو خدا کا فطری قانون دوسری اقوام میں نمودار ہوا۔ اور نام نہاد مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ یہ معاشی و سوشل رجحانات اصلی اسلام اور قرآن کے منافی ہیں۔

حالانکہ اگر ترتیب نزول قرآن کے مطابق قرآن کو ہم از سر نو پڑھیں، اور پھر اس کے بعد عمل رسول[ؐ] یعنی سیرت کا تاریخی مطالعہ کریں تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن و سیرت کا فطری طریق کار ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو انسانیت کو جمود سے نکال کر بام ترقی پر لے جا سکتا ہے۔ اور اس نے انقلاب کے جو تاریخی ادوار بنائے ہیں ان سے انسانی معاشرہ کا تاریخی ترتیب سے گزرنا لابدی ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی پہلی تعلیم میں ارباب من دون اللہ کے خلاف جو اعلان بغاوت ہے وہی حقیقی معنوں میں **اعلان انقلاب** ہے۔ اور تخلیق و تعلیم الٰہی کی بنیادوں پر جو عمارت تعمیر ہوئی ہے، وہی حقیقی اسلام ہے۔ شک کو یقین، ضلال کو ہدایت اور ظلمت کو

نور سے بدلنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو لوگوں میں
خدا سے محبت اور شیطان سے نفرت پیدا کی جائے۔ اس بنیادی اساس پر
پورے قرآن اور مکمل سیرت نبوی کو قائم کرنے کے بعد ہی اسلام کے حقیقی و
بنیادی خط و خال نمایاں ہو سکتے ہیں۔

The J & K University Library
Acc No. 19210

پہلی وحی کا پس منظر

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سنہ ۵۷۰ مسیحی میں ہوئی۔ اور سنہ ۶۳۲ مسیحی میں آپ نے وفات پائی۔ یہ زمانہ چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی کا درمیانی زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ انسان اس دنیا میں برابر ترقی کی طرف جا رہا تھا۔ بابل، مصر، سندھ اور یمن میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ نو ہزار سال سے ان ملکوں میں تمدنی ترقی ہو رہی تھی۔ اور مختلف قومیں اپنا اپنا مذہب، فلسفہ اور سائنس اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مصنوعات کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے تک پہنچا رہی تھیں۔ کبھی جنگ کے ذریعے سے ایک قوم کے غلام دوسری قوم کے فاتحوں کے لئے ذریعۂ معلومات بن جاتے تھے۔ کبھی امن کے ذریعے سے ایک قوم کے تاجر دوسری قوم کے تاجروں اور عوام تک اپنی بیش بہا مصنوعات اور ان کے ساتھ ساتھ اپنے قومی افسانے پہنچاتے رہتے تھے۔

ساحر و کاہن: ننھے محمد (صلعم) نے آنکھ کھلتے ہی یہ دیکھا کہ شہری ہو یا بدوی ہر عرب کا باشندہ سحر و کہانت اور نجوم کے ذریعے سے اپنی زندگی کی راہ بناتا ہے۔ اور پیشہ ور ساحروں اور کاہنوں، نجومیوں اور پروہتوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا ہے۔ وہ خود پروہتوں کے خاندان سے تھے۔ اس لئے سدنۂ قریش کی دسیسہ کاریوں سے اسی طرح واقف تھے جس طرح حضرت ابراہیم خالدیہ میں، حضرت موسیٰ مصر میں، حضرت گوتم بدھ ہند میں اور حضرت زردشت میدیہ میں اپنے اپنے خاندانوں کے پروہتوں اور غیب کا حال بتانے والوں کے اوچھے طریقوں سے واقف ہو کر ان کے

خلاف بغاوت پر مجبور ہوئے تھے۔

بچپن گزرا۔ طفولیت میں اپنے چچا کے ساتھ نئے ملکوں کی سیاحت کی۔ اور چالیس سال کی پختہ عمر تک خود بحیثیت تاجر کے عرب اور بیرون عرب کے چپے چپے کو آپؐ نے دیکھا۔ اور ہر جگہ یہی نظر آیا کہ ان کے دادا ابراہیمؑ (۲۱۹۱ سال قبل مسیح) کی بغاوت اور آتشین مصائب میں گزرنے سے پہلے حضرت نوحؑ (۴۰۰۰ سال قبل مسیح) کے طوفان سے بھی بہت پہلے، یعنی ابتدائے تمدن انسانی سے آدم اور آدم کی اولاد کا دشمن نفس امارہ رہا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا حربہ خود غرضی کا خنجر ہے جو برابر آدمؑ اور اس کی اولاد پر چلتا رہا ہے۔ ابلیس (دھوکا دینے والے نفس) نے انسان اول کو لالچ اور ہوس میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہمیشہ کی زندگی اور علوم خداوندی کی لالچ میں باغ عدن کی جنت سے نکلے اور اپنی اولاد کو محنت و مشقت کی زندگی میں پھنسا گئے۔ اگر اسے اسرائیلی استعارہ سمجھا جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان اپنے بچپن کی بے فکری اور سادہ لوحی سے نکل کر تجربہ اور مشقت کی زندگی میں آن براجا۔ اور قدرت نے اسے ایسا شعور بخشا کہ وہ اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر خود اپنے آپ کو خوف و جوع سے بچائے اور اپنے اعمال کا جواب دہ یا ذمہ دار قرار پائے۔ بالفاظ دیگر وہ حیوانیت سے نکل کر سمجھدار اور ناطق انسان بن گیا۔ اور اسے اختیار مل گیا کہ اپنا دین (قانون زندگی) ایسا بنائے کہ گویا شجر علم کا پھل کھا چکا ہے۔ اور اچھے برے کی تمیز کا شعور حاصل ہو گیا ہے۔ اُسے اختیار مل گیا کہ اس دنیوی زندگی میں دین حق (دین فطرت) پر چلے، یا دین باطل (غیر فطری و شیطانی) طریقے اختیار کرے کسی ایک طریقے (دین۔ ڈینا۔ دھرما۔ راہ۔ ریت۔ سٹریت۔ سطراطا۔ صراط) پر چلنے پر وہ مجبور نہ تھا۔ اس مجبوری کے دور ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار پایا کہ اگر وہ اچھا عمل کرے تو اچھی جزا ملے اور برا عمل کرے تو ویسی ہی سزا پائے

گویا جبر سے نکل کر قدر کے عالم میں آدم کا آنا ایسا ہی ہے کہ اسے جنت سے ہبوط کا نام دیا جائے۔

شرک کیا ہے؟

غرضکہ چالیس سال کی عمر تک جناب محمدؐ الامین اسی سوچ بچار میں رہے کہ انسانیت کو کس طرح اس "ضلال" یا شک اور بے راہ روی سے نکالا جائے جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد آدم ثانی حضرت نوحؑ کی اولاد گناہ میں آلودہ ہوتی رہی اور وہ "ظلم" یا بے اعتدالی و تاریکی کیا تھی جس کی وجہ سے ہبوط آدم ہوا۔ اور خود حضرت آدم اور ان کی اولاد یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ربنا ظلمنا انفسنا (خدایا ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا)

یہ ظلم در حقیقت وہ دھوکا تھا جس کی وجہ سے حضرت آدم نے شجر علم اور شجر زندگی کے پھل کھانے کی نافرمانی اور کوشش کی تھی۔ مقصد اس تمثیل کا صرف یہ ہے کہ جب سے انسان دنیا میں آیا ہے اس کی ایک بڑی جماعت خدائی احکام میں شیطانی احکام کو شریک کرتی رہی ہے۔ اس شرک فی الاطاعت کا بڑا محرک ہوائے نفس (وسواس الخناس) ہے۔ اسی کو قرآن نے آگے چل کر بتایا ہے کہ شرک یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات نفسیانی کی پرستش کرنے لگے اور ہوائے نفس کو اپنا اِلٰہ یا معبود مان لے (من اتخذ الٰہہ ھواہ)

آنحضورؐ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہوائے نفس (شیطان) کی بندگی ہی شرک ہے۔ اس کی بنیادی وجہ خود غرضی اور لالچ ہے۔ لالچ سے انسان دوسرے کے قتل پر تیار ہو جاتا ہے اور کینہ پروری اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اسی کی وجہ سے قابیل ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اسی کی وجہ سے کنس اور فرعون ہزاروں معصوم بچوں کو قتل کراتے رہیں گے۔ اسی لالچ اور ہوس جاہ کی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ جنگیں ہوتی رہیں اور اسی لوبھ میں پھنس کر انسان مشرک اور ملحد بنتا رہے گا۔ اور ساحروں، کاہنوں، پروہتوں، شاعروں

اور ادیبوں کی ایسی جماعتیں بھی بنتی رہیں گی کہ ذاتی منفعت کے لئے جذبات کا نامعقول استعمال کریں۔ اور اپنی خواجگی منوا کر دنیا کو غلامی اور خوف کے دریا میں غرق کردیں۔ یہ اثر تھا جو آنحضرت نے عربی معاشرت و تاریخ سے حاصل کیا اور اسی شرک و خود غرضی کو آدم سے موجودہ عہد تک انسانی تباہی کی تہ میں کار فرما پایا (والعصر ان الانسان لفی خسر۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں اس لئے ہے) کہ اس نے اللہ پر بھروسہ چھوڑ دیا ہے اور حق کی جگہ باطل یعنی خود غرضی و شیطنت اس کے خیال پر چھا گئی۔ اسی حرص و ہوا (لوبھ۔ لالچ) کی وجہ سے انسان معصیت الٰہی کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی شرک ہے یعنی شیطان کی طاعت اللہ کی طاعت پر غالب آجاتی ہے۔ اس نافرمانی (شرک فی الطاعت) کی وجہ سے حضرت آدم تک معتوب ہوئے۔ اور اسی شرک نے دنیا کی کل قوموں کو تباہی میں ڈالا۔ عاد و ثمود، قوم لوط و قوم فرعون اور جتنی اقوام تباہی میں پڑیں وہ شرک کی وجہ سے پڑیں۔ غرضکہ شیطان پرستی یا نفس پرستی کو آنحضرت نے وجہ زوال اقوام قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی ملحد بھی انکار نہیں کرسکتا۔

تنزل کا علاج: لیکن اس سلسلے میں آنحضرت نے یہی نہیں کیا کہ وجوہ ضلال معلوم کئے۔ آپ نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ شک سے یقین، اور ضلال سے ہدایت پر لانے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟

انسانی پستی کا ایک علاج تو وہ ہے جو اکثر انبیاء، حکما، صلحا اور ہادی کرتے آئے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے طریقے سے عامۃ الناس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ برے کام نہ کرو۔ اسی لئے قدیم اقوام کے جتنے مذہبی ہادی گزرے ہیں وہ اوامر کم اور نواہی زیادہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً قتل نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ کسی کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ شرک نہ کرو جھوٹ نہ بولو وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک زمانہ آیا جس میں ہادیوں نے یہ بتایا کہ

یہ باتیں کرو۔ مثلاً غریبوں کی مدد کرو۔ عدل و انصاف کرو۔ سچ بولو۔ رحم کرو فیاضی کرو وغیرہ وغیرہ۔

اگر آپ قرآن کا تنزیلی ترتیب سے مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوگا۔ کہ ابتدائی دور میں آنحضرتؐ بطور منذر (نواہی سے بچانے والے) اور مزکی (اوامر کا حکم دینے والے) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ان کا کام یہیں ختم نہیں ہوا۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ قرآن میں تدبر کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ نے انبیائے اولی العزم ان رسولوں کو بتایا ہے جنھوں نے لوگوں کو ایک سلطنت قائم کرنے میں مدد دی۔ اور انھیں سلطنت و معاشرت کے لئے ایک قانون (شریعت) دیا۔ حضرات ابراہیم و موسیٰ، داؤد و سلیمان، اور بعض بادشاہوں کا بھی اسی ضمن میں ذکر ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو فلسفیانہ طریقے پر اخلاقی قدریں بتا دینا کافی نہیں ہے بلکہ ان قدروں کی بنیاد پر جب تک ایک کتابی سلطنت نہ قائم کردی جائے مقصد اسلام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اسی لئے آنحضرتؐ نے قرآن کے ذریعے ان اخلاقی قدروں کو سمجھایا جو انسان کے لئے ضروری بلکہ اہم ہیں۔ پھر ان اخلاقی قدروں (یعنی فلسفۂ اخلاق) کی بنا پر ایک ایسی کتابی سلطنت قائم کرکے دکھادی جو دنیا والوں کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ قیام سلطنت کتابیہ کے دوران میں کتاب اللہ کی جو عملی تفسیر آنحضرتؐ نے فرمائی اسی کو ہم سنت نبوی کہتے ہیں۔ اور سیرت نبوی کو قرآن کے ساتھ پڑھ کر معلوم کرسکتے ہیں۔

غار حرا کی وحی اول اس انقلاب کا پہلا اعلان ہے۔ اسی اعلان نے انسان کی مادی اور معاشی ضلال و بے راہ روی کو امن دوستی سکھائی۔ جس کا لازمی نتیجہ فارغ البالی اور روحانی طمانیت ہے۔

یہی ایک طریقہ ہے کہ انسان شرک سے بچے اور خوف و جوع سے نجات پاکر پکا موحد اور مومن باللہ بن جائے۔

آنحضرت کی پوری سیرت یہی بتاتی ہے کہ آپ نے کس طرح دولت کتابیہ قائم کی اور حضرت آدمؑ کے وقت سے جو لالچ کا زہر شرک بن کر انسان کے خمیر میں پڑ گیا تھا اسے کس طرح پہلے وعظ و نصیحت سے اور پھر بجبر و زور دور کیا۔

فلسفۂ عالم اور فکرِ محمدیؐ

خندہ از گل، گریہ از ابرِ بہار آموختیم
من ز ہر صاحبدلے یک شمہ کار آموختیم
(غالب)

عمل سے پہلے فکر ضروری ہے: یہ ایک مسلمہ ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے انسانی دماغ میں اس کام کے کرنے کا تصور اور ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے چالیس سال کی عمر تک آنحضرتؐ مختلف تجربات حاصل کرتے رہے۔ اپنی قوم اور دوسروں کے عروج و زوال کے نقشوں پر نظر ڈالی اور اپنے عہد کی رومی و ایرانی کش مکش پر غور کیا، اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ شیطان پرستی ہی نے امن کی جگہ خوف، سیری کی جگہ بھوک، سرور کی جگہ حزن اور آزادی کی جگہ غلامی پھیلا رکھی ہے۔ خوف و حزن، جوع و رقیت لوازمات کفر میں سے ہیں، اور ان سے نکلنے کا نام ہی اسلام ہے۔ یہ اسلام طاعت الٰہی کا دوسرا نام ہے اسی کو صراط مستقیم بھی کہتے ہیں (ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ۔ ھذا صراط مستقیم ۝)

غرضکہ جب آنحضرتؐ کا ایک فلسفۂ زندگی بن گیا اور آپ نے خدا پرستی ہی کو ذریعۂ نجات مان لیا تو آپؐ نے مختلف اقوام کو صراط مستقیم پر ڈالنے کا ارادہ کیا اسی لئے سب سے پہلے آپؐ نے شیطان (وسواس الخناس یا ہوائے نفس) پر لعنت بھیجی اور نسلِ انسانی کے اس دشمن کے مقابلہ میں اللہ سے مدد مانگی۔ اسی کا نام "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا۔ کہ دنیا کی ان اقوام میں جو مختلف خداؤں (یا دیوتاؤں)

کی پرستش کرتی ہیں، ان میں اچھے اور بُرے دونوں قسم کے دیوتا مانے جاتے ہیں اور دونوں قسم کے دیوتاؤں کو مختلف قسم کی قربانیوں اور نذرانوں (یا رشوتوں) سے خوش کیا جاتا ہے۔ بلکہ بُرے دیوتاؤں کی شرارت سے محفوظ رہنے کے لئے ان کو زیادہ رشوتوں یا قربانیوں سے خوش کیا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہوگئی کہ بعض فرقے صرف شیطان پرست بن گئے۔ اس لئے کہ خدائے خیر کے خوش رکھنے سے زیادہ خدائے شر کو خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت ہے۔ (اس قسم کا ایک فرقہ یزیدی ایران و عراق میں اور بام مارگی ہندوستان میں اب تک موجود ہے۔ آخرالذکر گوشت خوری۔ شراب نوشی اور زنا کو نجات کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کو راز میں رکھتے ہیں۔ قرآن نے انھیں اصحاب الشمال کہا ہے۔ بابل میں اشتر دیوی اور عرب میں لات منات اور عُزّیٰ کی بھی پرستش اسی قبیل سے تھی)

عام طور پر خداؤں کی تقسیم اچھے اور بُروں پر ہوئی۔ پھر ان کا ایک ایک بادشاہ یا بڑا خدا مان لیا گیا۔ ایک خدائے ایزدھا اور دوسرا خدائے دیواں ایک کو اوستانے اہورامزدا (ہرمز) اور دوسرے کو اہرمن قرار دیا۔ اور پرستش میں ثنویت شروع ہوگئی۔ یعنی ہرمز کی سلطنت آسمان پر اور اہرمن کی زمین پر قرار پائی۔ لیکن زردُشت نے اس تصور کو باطل قرار دیا اور اہورامزدا ہی کو واحد خدائے کائنات تسلیم کیا۔ اس کی کتاب ون۔ دیو۔ داد (وندیداد) درحقیقت دیووں یعنی شیطانوں کو دور کرنے کے منتر ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ سب تعوذ کی شکل میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہیں۔

فلسفہ یا فکر انسانی کے مختلف نظریے

دنیا والے ہزاروں سال سے خیالی جنتیں بنا رہے تھے، لیکن اس جنت میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک نیا جہنم ہے، اور عذاب کی نوعیت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لوٹنے والی ارتجاعی قوتوں کی بنیاد خود غرضی و حرص و آز پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو مفکر یا جماعت بھی نظام نو یا نئی جنت بناتی ہے اس پر چند ہی دنوں میں ارتجاعی خود پرست قبضہ کر کے پھر اسے جہنم بنا دیتے ہیں، بقول غالب ؎

جنت نکند چارۂ افسردگیٔ دل　　　　تعمیر باندازۂ ویرانیٔ ما نیست

آخر کار چھٹی صدی کے اواخر میں رسول عربیؐ پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۶۱۰ء میں اُن پر یہ شرح صدر ہوا کہ دنیوی جہنم کو بدلنے کا طریقہ صرف وعظ و مجاہدہ و تزکیہ نہیں، بلکہ خدا کا قانون جاری کرنے والی مجاہدین کی جماعت تیار کر کے ایک دولت کتابیہ قائم کرنا ہے۔

ایں راز کہ در سینہ نہان است، نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت　　(غالب)

اس مقصد کے تعین کرنے کے لئے آپؐ ہر سال مکہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک روشن کھوہ کے اندر رمضان (نومبر دسمبر) کا سرد موسم گزارا کرتے تھے۔ یہاں آپ کے تصور میں نہ صرف اپنے بچپن کی زندگی۔ یتیمی، بے مائگی، نکاح و فراغت مالی کے واقعات ذہن میں آتے تھے، بلکہ آپؐ یہ محسوس کرتے تھے کہ رات ہو یا دن کسی وقت خدا نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ قنوط و یاس کا کبھی حملہ نہیں ہوا۔ بلکہ

خدا نے وہ خود اعتمادی پیدا کر دی جس نے زندگی کو ہمیشہ پُر امید، اور آنے والی عالت کو پہلے سے بہتر بنائے رکھا (وللاٰخرۃ خیرٌ لك من الاولیٰ) آپ نے دیکھا کہ پہلے بھی بہت سے مفکر زندگی کے معمّے کو حل کرنے میں اپنی عقل کو کھپا چکے ہیں، اور لوگوں کو فارغ البالی، خوش حالی اور نجات کا راستہ بتا چکے ہیں۔ مثلاً کوئی حقیقتِ وجود معلوم کر کے اپنا رستہ (صراط) متعین کرنا چاہتا تھا، کوئی حقیقتِ علم معلوم کر کے صحیح علم کو ذریعۂ نجات بنانا چاہتا تھا پھر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خود انسان کی اس کائنات میں کیا جگہ ہے۔ ہم مختصراً ان مسائل کو درج ذیل کرتے ہیں۔

فلسفے کے دو بنیادی مسئلے (نظریۂ ہستی و نظریۂ علم)

ہر قوم کا بلکہ ہر انسان کا کچھ نہ کچھ فلسفہ ہوتا ہے اور یہ فلسفہ مختلف تاریخی و تعلیمی احوال سے بدلتا رہتا ہے۔ عربی میں فلسفہ کو حکمت کہتے ہیں اور قرآن میں جابجا یہ کہا گیا ہے کہ قرآن کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ قرآن نے "کتاب" علم و قانون حیات کو کہا ہے۔ اور حکمت اس فلسفۂ حیات کو جس پر قانون کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں یعنی علم و فلسفۂ حیات کا فیضان خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی اور ہستی کی طرف سے نہیں ہوتا۔ "یعلمہ الکتاب والحکمۃ" اس ثبوت کے لئے کافی ہے۔

فلسفے کے دو بنیادی مسئلے ہیں: (۱) یہ کائنات کیا ہے، (۲) انسانی علم کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عقائد کا انسان کے عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

فلسفہ و حکمت کا یہ کام ہے کہ مندرجۂ بالا دو مسئلوں کے متعلق انسان نے جو عقائد قائم کر لئے ہیں ان کی جانچ کرے اور انھیں مرتب کر دے۔

فلسفے کا کام یہ بھی ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ یہ عقائد کیوں پیدا ہوتے ہیں اور ایک زمانے میں کیوں ایک نظریہ مقبول ہوتا ہے اور دوسرے زمانہ میں دوسرا کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یعنی مختلف زمانوں میں مختلف عقیدے کیوں اور کس طرح بدلتے رہتے ہیں؟

پہلا کام یعنی عقائد کی جانچ اور ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش سقراط کے زمانے میں یونان میں شروع ہو گئی تھی۔ ہند اور چین میں یہ کام سقراط سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اور چونکہ عرب سے مختلف قوموں کی تجارتی گزرتی تھی اس لئے ہند۔ ایران۔ یونان اور روم کے فلسفے (حکمت) اور کتاب (قانون) کے متعلق ہر طرح کے خیالات مکہ میں عام ہو گئے تھے، لیکن ان کی تحقیق رسول عربی کے زمانے سے پہلے شروع نہیں ہوئی تھی۔ مکہ اگرچہ بلخ و سکندریہ کی طرح دنیا کی قوموں کا سنگم تھا، لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے وہاں رسول عربی ؐ سے پہلے کوئی ایسا مفکر یا نبی نہیں پیدا ہوا جو اس کو ایک قوم بنا دیتا اور ایک فلسفۂ زندگی اُن کی زبان میں ان کے سامنے رکھتا۔

دوسرا کام، یعنی عقائد انسانی کیوں بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی قرآن نے قدیم اقوام عاد۔ ثمود۔ بنو اسرائیل۔ مصری قوم اور دوسری قوموں کی ترقی اور زوال کا فلسفیانہ مطالعہ پیش کیا ہے اور ہر قوم کی ترقی یا تباہی کو نتیجہ بتایا ہے ان کے فلسفہ اور عمل کا۔ یہ سب تحقیق ابتدائے آدم سے رومن سامراج اور ایرانی شہنشاہیت کے اس دور تک کی قرآن میں تاریخی تسلسل کے ساتھ خطابی رنگ میں پوری پائی جاتی ہے۔ ترتیب نزول قرآن سے فلسفہ اور تاریخ کا یہ پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن نے فلسفہ یا حکمت تک پہنچنے کے مندرجہ ذیل مدارج بتائے ہیں جنھیں ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے۔

۱۔ خوف اور بھوک

انسانی تمدن، تہذیب یا کلچر میں جو عناصر کام کرتے ہیں ان میں سب سے پہلا عنصر تو جسمانی بھوک اور

حفاظت جان کے فطری رجحان کا ہے یعنی اقتصادی انسان کے لوازم: محنت زراعت، تجارت، گروہ بندی اور اپنی حفاظت کے لئے ایک سلطنت، جس کے قوانین ایسے اخلاقی قوانین یا رسوم پر قائم ہوں جو انسان نے اپنے تجربہ سے عام مفاد کے لئے رائج کر لئے ہوں۔ (سورہ قریش)

۲۔ تجربہ و مشاہدہ (علم کتاب)

معاشی بہتری اور حفاظت جان کے لئے قوانین قدرت کا علم ضروری ہے۔ اور انسان کو ایسا علم (یعنی سائنس) رفتہ رفتہ مشاہدہ و تجربے سے حاصل ہوتا رہتا ہے، اور اس کو وہ اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا سیکھ جاتا ہے (سورۃ العلق)

۳۔ علم اور علم غیب

وہ عقیدے جو ماورائے فطرت، یا ماورائے تجربہ ہوتے ہیں۔ مثلاً مرنے کے بعد کی زندگی، روح، نجات کا تصور وغیرہ عالم غیب سے متعلق ہیں، اور انسان ان عقائد کو اپنی بھلائی اور دکھ سے نجات کے لئے استعمال کرتا ہے، یہ شیطانی بھی ہو سکتے ہیں اور رحمانی بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اصلی علم غیب خدا ہی دیتا ہے۔

۴۔ حکمت یا علوم کا عطر

انسان فلسفہ یا حکمت کے ذریعے سے اپنے کل علوم (ہیئت، ریاضی، سائنس، حیاتیات وغیرہ) کی مدد سے ماہیت اشیا، ماہیت علم، اور وہ اصول یا اسباب معلوم کرنا چاہتا ہے جو بنیادی ہوں۔ مثلاً سچائی کی کیا حقیقت ہے۔ حسن و جمال کسے کہتے ہیں۔ خیر و شر کے کیا معنی ہیں۔ عدل و ظلم کا انسانی سوسائٹی اور اس کی ذاتی زندگی میں کیا درجہ ہے۔ ان سوالات نے الٰہیات، نفسیات، منطق، اور علم الاخلاق کو پیدا کر دیا ہے۔ یہ سب علوم اگر نفسانی خواہشات پر قائم نہیں، بلکہ بے لوثی سے عام انسانیت کی فلاح کے لئے بذریعہ قلم حاصل کئے گئے ہیں تو یقیناً "رحمانی" (یا اچھے) ہیں (سورۃ العلق)

(الف) فلسفۂ ہستی (یا نظریۂ وجود)

وجود یعنی ہستی کی حقیقت کے متعلق مختلف سوچنے والوں نے مختلف نظریئے بنائے ہیں۔ یہ کائنات کیا ہے، وجود کی حقیقت کیا ہے، یا دوسرے لفظوں میں جو کچھ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہے، وہ درحقیقت ہے؟ یا صرف دھوکا ہے؟

سوچنے والے انسانوں کے دل میں اس سوال کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ جب وہ زمین آسمان اور قدرت کے کارخانے پر نظر ڈالتے تھے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ ہر چیز حیرت کا باعث تھی۔ سورج، چاند، تارے رات کو! پھول، پھل، پرندے، جانور دن کو! اور خود اپنی ذات ہر وقت ایک گورکھ دھندا بنی رہتی تھی۔

۱۔ روحانیت

کوئی کہتا تھا کہ دنیا میں ہر چیز جان دار ہے۔ پھول اور درخت ایک دوسرے سے اسی طرح باتیں کرتے ہیں جس طرح پرندے اور جانور ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے ہیں۔ انسان ہی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ سوچتا سمجھتا اور بولتا ہے۔ بلکہ ہر شے کسی نہ کسی پیرائے میں اپنے "خیالات" دوسرے کو پہنچاتی رہتی ہے۔ غرضکہ جن چیزوں کو ہم بے جان یا غیر ذی روح کہتے ہیں انھیں بھی لوگ جاندار سمجھتے تھے۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ جاندار اور بے جان کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ پرندے جانور اور انسان وغیرہ جو اپنے ارادے سے حرکت کر سکتے ہیں وہ تو جاندار ہیں، اور بقیہ کائنات میں درخت پودے یا گھاس وغیرہ نہ تو بالکل بے جان ہیں نہ پورے طور پر جاندار، اور جو چیزیں بالکل حرکت نہیں کر سکتیں وہ بے جان ہیں۔ اس کے بعد انسان کی روح کو حیوانات اور نباتات کی روحوں سے اونچا درجہ دے دیا گیا اور کہا گیا کہ حقیقت میں انسان کی

روح ہی اس قابل ہے کہ اسے روح کہا جائے اور باقی سب بے جان ہیں یا ایسی جان رکھتے ہیں جو اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچی اور ان کا شمار بھی مادہ ہی میں کیا جاسکتا ہے۔ یعنی انسان ہی ایسی روح (یا شعور) رکھتا ہے کہ بھلے بُرے میں تمیز کرسکے اور دو راستوں میں سے اچھی راہ اختیار کرسکے یا بُری راہ۔ لیکن جانوروں اور پودوں وغیرہ کو اپنی راہ عمل اختیار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ جو راہ عمل فطرت نے ان کے لئے متعین کردی ہے اسی پر مجبوراً چلیں۔ اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ دنیا میں روح ہی روح ہے، مادہ کی کوئی حقیقت نہیں، مادہ بھی روحانی تصور کا ایک کرشمہ ہے یا مادہ بھی خدا کی ایک شان ہے (وحدت وجود)

اختیار اس طرح صرف انسان، اور انسان بھی وہ جو عاقل و بالغ ہو، اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پایا اور دنیا کا جتنا قانون انسانوں نے بنایا اس میں یہ تسلیم کرلیا گیا کہ صرف انسان میں اس درجے کی روح اور شعور موجود ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہو

روح اعظم روح سے روح اعظم کا تصور پیدا ہوا جس کے متعلق بھی دو نظریئے بنے۔ یعنی (۱) دنیا میں روح ہی روح ہے یا (۲) روح مادّہ سے الگ ہے لیکن مادّہ پر حکمراں ہے۔

۲۔ مادّیت بعض سوچنے والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ روح کا انکار کردیا اور کہا کہ مادّہ ہی سے ہر چیز بنتی ہے۔ یعنی جس طرح ستار کے تار سے آواز پیدا ہوتی ہے اُسی طرح جسے ہم جاندار کہتے ہیں، اُس کی جان اُس آواز کی مانند ہے جو لوہے کی اس شکل سے پیدا ہوتی ہے جسے ہم تار کہتے ہیں۔ اگر مختلف عناصر مادی ایک خاص شکل اختیار کرلیں اور ان میں خون (یا رس) دوڑنے کا ایک مادی نظام بن جائے تو یہی جان (یا آواز) ہے۔ جب عناصر کی یہ ترتیب مٹادی جاتی ہے، یا کسی

وجہ سے مٹ جاتی ہے، تو جان بھی باقی نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مادّہ ہی مادّہ ہے اور جسے ہم روح یا جان کہتے ہیں وہ بھی مادّہ کی ایک قسم ہے کوئی الگ شے نہیں ہے۔

جبر اس نظریئے کے ماننے والے کہتے ہیں کہ جس طرح حیوانات و نباتات فطری طور پر اپنے مخصوص اعمال کرنے پر مجبور ہیں، اُسی طرح انسان بھی مجبور محض ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، ان مادی اجزائے ترکیبی کی وجہ سے کرتا ہے جو اس کے دماغ میں ایک مخصوص اندازے کے ساتھ ہیں اور مخصوص اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ گویا انسان بھی مادی چیزوں کی طرح اپنے اعمال میں مجبور محض ہے۔ یہ مادیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

الحاد : چونکہ مادیت کسی قادر روح (یا مدبر) کو تسلیم نہیں کرتی، اس لئے مادیت کا نتیجہ الحاد و انکار روح ہے۔

۳۔ امتزاج مادیت و روحانیت

عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مادہ اور روح دونوں موجود ہیں اور الگ الگ وجود رکھتے ہیں۔ روح مادّہ کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور طاقتور ہے۔ بغیر روح کے مادہ میں حرکت و ترقی کا وجود نہیں پایا جاسکتا۔ جب روح کسی مادی جسم سے ملتی ہے تو اس میں مادہ کی صورت کے مطابق حرکت نمودار ہوتی ہے۔ حرکت کے ساتھ ساتھ ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ارادہ اپنے مادّی جسم کی حد بندیوں سے محدود یا مجبور ہوتا ہے۔ یعنی ایک خاص حد تک ہی عمل کرسکتا ہے۔ لیکن ارادہ روح ہی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے روح مادّہ پر غالب ہے یا مادّہ کی محرک ہے۔

جبر و اختیار : اس طرح روح میں ایک خاص حد تک اختیار بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک اپنے مادی جسم کی وجہ سے مجبور بھی ہوتی ہے۔ لیکن روح کا جسم پر غلبہ ہوتا ہے گویا روح سوار ہے اور جسم گھوڑا ہے۔ گھوڑے کو

سوار جدھر لے جانا چاہے لے جائے۔ اگر گڑھے میں کدائے گا، تو گھوڑا مر جائے گا، اور خود بھی اس شکل میں باقی نہ رہے گا۔ گویا اسے ہر اس قسم کے عمل کا اختیار ہے جو گھوڑا اپنے قویٰ کے ساتھ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ چاہے کہ گھوڑا آسمان پر اُڑنے لگے تو چونکہ گھوڑا مجبور ہے اس لئے اس کا سوار اس سے یہ عمل نہیں کرا سکتا۔ اس طرح روحانیت اور مادیت کے ملانے والے جبر و اختیار کی بھی حد بندی کر دیتے ہیں۔ اور روح کو اس کے اعمال اختیاری کا جوابدہ مانتے ہیں۔ لیکن اسی حد تک جہاں تک کہ اس کی طاقت وبساط یا ارادہ سے کوئی فعل ہوا ہو۔

خالق کا تصور: روح اور مادہ دونوں کو ماننے والے ایک ایسی روح کو بھی مانتے ہیں جو روح اور مادہ دونوں کی خالق ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور وہی خالق و قادر ہونے کی وجہ سے مختار کل بھی ہے۔ وہ جو چیز جس طرح کی چاہے بنائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تصور ہے کہ اس نے کسی غرض و غایت سے ہر اچھی بُری چیز بنائی ہے۔ اچھائی یا بُرائی اس شئے کے مقصد سے متعلق ہوتی ہے۔ گو ہمارے افکار و خیالات اُسے اچھا یا بُرا بنا لیتے ہیں لیکن درحقیقت کوئی چیز فی نفسہ بُری یا اچھی نہیں ہوتی۔ چونکہ جو خالق و قادر ہے وہ نہایت ہی رحیم، حکیم، عادل و کارساز ہے، اس لئے وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اُسے کسی نہ کسی بہتر مقصد کے لئے بناتا ہے۔

(نوٹ:۔ مادیت و روحانیت کے سلسلے میں سیرت محمد صلعم کی دوسری فصل بھی دیکھنا چاہیے)

(ب) فلسفۂ علم یا نظریۂ علم

فلسفہ کا دوسرا مسئلہ ہمارے علم سے متعلق ہے۔ یعنی خود علم کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ انسانی علم کا مسئلہ وجود کی ماہیت کے مسئلہ سے زیادہ

گہرا ہے۔ اس سلسلہ میں جان لیوس اپنی کتاب مقدمہ فلسفہ کے صفحہ ۱۱ پر کہتا ہے کہ کسی عقیدہ کو لے لیجئے اور تحقیق کیجئے کہ کیوں آپ نے اسے مانا ہے:

"(۱) کیا محض اس لئے مان لیا کہ ہر شخص اسے مانتا ہے اور عام طور پر یہی مانا جاتا ہے؟

(۲) کیا پروپاگنڈا کرنے والوں نے آپ کو یہ بات منوا دی ہے اور مذہبی سند کی وجہ سے آپ نے یہ بات مان لی ہے؟

(۳) کیا اس کے متعلق دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ضرور سچ ہے؟ یعنی یہ عقیدہ حدس (INTUITION) پر مبنی ہے؟

(۴) کیا آپ اس پر اس لئے یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح ماننے میں کام چل جاتا ہے اور انسان کی بھلائی کے لئے یہ عقیدہ ضروری معلوم ہوتا ہے؟

(۵) کیا یہ عقل (یعنی تجربہ) کی بنیادوں پر قائم ہے؟"

کاغذ کی ایجاد اور علم کو عام کرنے کی جو تحریک مسلمانوں نے شروع کی تھی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہسپانوی سلطنت کے ذریعے سے یورپ میں روشن خیالی شروع ہوئی، اور پادریوں ہی نے عوام کو علم سے آشنا کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ یورپ میں لاک، ہیوم اور کانٹ پیدا ہوئے جو کہتے تھے کہ کل علم تجربہ سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ ان کے ہمعصر بشپ بارکلے اور ہیل برانش یہ دعوے کرتے رہے کہ علم مافوق الفطرت طریقے سے حاصل ہوتا ہے مذہب کا یہ اثر تھا کہ "دے کارت کے پیرووں کے نزدیک صداقت کا معیار یہ تھا کہ وہ اسے بلا دلیل سچ مانتے تھے، اور در حقیقت جس چیز کو وہ "عقل بلا دلیل" کہتے تھے وہ صرف انجیل مقدس سے پوشیدہ قسم کی اپیل تھی۔ یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ پرانے عقائد کو کسی نہ کسی طرح نئے خیالات کے مطابق بنایا جائے" (اے۔ ڈبلو۔ بن کی ماڈرن فلاسفی)

ہم نے اوپر شق نمبر ۳ میں حدس کا ذکر کیا ہے لیکن سائنس کی دنیا میں،

جب تک عقل و تجربے کی کسوٹی پر کسی خیال کو نہ کسا جائے اُس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے مسلمانوں نے قرآن کی پیروی میں ہر جگہ "عقل و تدبر فی خلق اللہ" کو پیش نظر رکھا اور صرف حدس کی بنا پر کسی بات کو قبول نہیں کیا اور افلاطون و ارسطو کے مدرسوں کو جنھیں نصرانی شہنشاہ جسٹی نی ان نے ہزار سال تک بند کر رکھا تھا دوبارہ کھولا۔ پھر ابن رشد نے ارسطو کے تجربی فلسفہ میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ گو ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کا قول تھا کہ جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے وہ تجربے اور مشاہدے سے ہوتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس نے جن مضامین پر قلم اٹھایا ہے وہ سب اس کے تجربے پر مبنی تھے۔ مثلاً اس کی ہیئت محض خیال آرائی ہے اور حیاتیات بھی رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ اور چونکہ یونان میں غلامی کا عام رواج تھا اس لئے اس نے انسان کو آزاد اقتصادی انسان کے طور پر نہیں پہچانا بلکہ سکندر کی شہنشاہیت کا معمار بن کر دنیا میں انفرادیت اور یونانی امریت کو چھوڑ گیا۔ لیکن اس نے یہ بڑا کام کیا کہ افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق م) کے عالم مثال یا عالم اشباہ کے دھوکے سے سمجھدار لوگوں کو بچالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افلاطون کے زمانے میں ایتھنز کی سلطنت دم توڑ چکی تھی، افلاطون کو انسانی معاشرہ میں جو نقص نظر آتا تھا وہ اسے عالم شہود میں بھی نظر آنے لگا تھا لہٰذا اس نے یہ نظریہ بنایا تھا کہ عالم شہود کا کامل نقشہ ایک خیالی عالم میں ہے جسے وہ عالم مثال کہتا تھا اور محسوس دنیا کے نقص سے فرار ہو کر عالم مثال کے فرضی کمال میں پناہ لینا چاہتا تھا۔

سولھویں صدی مسیحی تک نصرانی کلیسا میں فلاطینوس (Plotinus) کا تصوف رائج ہو چکا تھا جسے نو افلاطونیت (افلاطونیۃ الحدیثہ) بھی کہتے تھے اور عقل و تجربہ کی جگہ ایک قسم کی روحانیت نے لے لی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ لوگ حدس اور الہام کے ذریعے سے یا روحانی طور پر کشف کے ذریعے سے

علم کا حاصل ہونا سمجھتے تھے۔ لیکن سب سے پہلے ابن رشد نے اور اس کے بعد سترھویں صدی میں لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴) نے "پیدائشی تصورات" کی مخالفت کی۔ اور موجودہ سائنس نے علت و معلول کا لزوم انسان کے دل میں تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر راسخ کر دیا۔ اور یہ نظریہ پیش کیا کہ غیب یا باطن کا علم روحانیت یا روحوں کے ذریعے نہیں، بلکہ مشاہدہ اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ بھی بتایا کہ جن تصورات کو ہم "پیدائشی تصورات" کہتے ہیں وہ بھی تجربے ہی کی پیداوار ہیں۔ یعنی ذریعۂ علم ہمارے حواس ہیں۔

یہ خیال کہ باطن یا غیب کا علم روحوں کو ہوتا ہے اور وہ ہمارے علم میں بذریعہ الہام لاتی ہیں، دنیا میں عام تھا۔ اور اسلام کے ظہور کے وقت عرب اس خیال سے مستثنیٰ نہ تھا۔

امتزاج الہام و مشاہدہ دنیا میں یہ خیال عام تھا کہ نجومیوں اور کاہنوں کو ستاروں اور جنوں سے تعلق ہے۔ اور وہ چھپی ہوئی باتیں معلوم کر کے لوگوں کو بتا سکتے ہیں۔ وحی اول سے آپ کو معلوم ہو گا کہ آنحضرت ؐ نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ چھپی ہوئی باتیں (غیب) کسی پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ البتہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ نہ صرف علم غیب، بلکہ کل علم مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ علم خواہ محسوسات کا ہو (جو ہمارے ظاہری حواس سے حاصل ہوتا ہے) خواہ وہ غیر محسوس اور غیر معلوم باتوں سے متعلق ہو (جو ہمارے باطنی حواس سے ہمارے ادراک میں آتا ہے) یہ سب علم ظاہر و باطن اُن حواس و شعور سے حاصل ہوتا ہے جن کا خالق اللہ ہے۔ گویا حدس الہام یا وحی ایک قسم کے ذہنی یا روحانی مشاہدے کا نام ہے۔ موجودہ عہد کے سائنٹسٹ بھی مانتے ہیں کہ سائنس کی اکثر دریافتیں اسی قوت حدس یا الہام کی محتاج ہیں۔ اور اکثر پاکیزہ روح والے انسانوں کو خواب (رؤیا) اور بیداری (رأی) میں ایسی باتیں قبل از وقت بذریعہ حدس معلوم ہو جاتی ہیں، جن کا

تعلق صرف ظاہری حواس کی کار فرمائی سے نہیں ہوتا۔

البتہ قرآن ان الہامات میں جو شیطنت کی طرف مائل کرتے ہیں، اور ان الہامات میں جو قوانین الہیہ کی طرف لے جاتے ہیں، یہ امتیاز کرتا ہے کہ شیطانی الہامات، شیطان کی طرف سے جن لاتے ہیں (جیسا کہ خود عرب کے کاہنوں شاعروں اور نجومیوں کا خیال تھا) اور رحمانی الہامات خدا کی طرف سے ملائکہ یا خدا کے ایلچی لاتے ہیں اور قلب انسان پر وحی کرتے ہیں۔

اس طرح آنحضرتؐ نے ایک طرف تجربہ و مشاہدہ یعنی سائنس کی اہمیت کو زیادہ کیا، دوسری طرف خود وحی و الہام کو خواص کا طریقہ علم بتا کر اسے بھی مشاہدہ (یا سائنس) کی ایک شاخ بنا دیا۔ البتہ معیار یہی رکھا کہ جس طرح سائنسی مشاہدہ حقیقت و صداقت کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح الہامی مشاہدہ بھی حقیقت کو واضح کرتا ہو۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ وسواس الخناس ہے۔ یعنی القائے شیطانی اور غیر سائنسی ہے۔

فلسفے کے دو بنیادی نظریے

غرضکہ جب سے دنیا قائم ہے سوچنے والوں نے بیسیوں نظریئے بنائے اور ان نظریات کی روشنی میں زندگی کا حل ڈھونڈھا۔ اس طرح فلسفے کے دو بنیادی مسئلے بن گئے۔ (۱) یہ کائنات کیا ہے۔ اور (۲) علم و فہم انسانی کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ پہلے کو نظریۂ وجود یا نظریۂ ہستی (وجودیات) کہتے ہیں اور دوسرے کو نظریۂ معرفت یا نظریۂ علم (علمیات) مگر ہیں دونوں نظریئے۔ یعنی فلسفیوں نے ہستی اور علم کے متعلق مختلف اور بعض اوقات متضاد تصورات قائم کر لئے، اور حقیقت تک پہنچنے کا اب تک کسی نے دعوےٰ نہیں کیا۔ یعنی سیکڑوں سال پہلے ہم جس جگہ تھے آج بھی ان ہی گتھیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

بقول خیام ؎

اسرار خدا را نہ تو دانی و نہ من
وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

قرآن کی پہلی وحی ان ہی دو مسئلوں سے شروع ہوتی ہے، اور ان کی بنیاد پر جو فلسفۂ عمل بناتی ہے وہ اسلام ہے۔ اس وحی نے جزم کے ساتھ نظریۂ وجود و نظریۂ علم کے متعلق ایک فیصلہ کن بات کہہ دی اور شک کی دنیا کو یقین سے بدل دیا۔ اسی لئے ہم نے اس پہلی وحی کو فاتحۃ الکتاب، کنز، کافیہ اور شافیہ قرار دیا ہے۔ یہ زندگی کے دو بنیادی مسئلوں کو دو دو آنکھوں سے دیکھ کر ایک نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ یعنی وجود و علم کا فیضان اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

نظریات ہستی وعلم اور پہلی وحی

مکہ سے تین چار میل دور ایک پہاڑی پر رمضان (دسمبر) کے مہینے میں رسول اللہؐ ہر سال تحنث یا بقول عینی شارح بخاری عبرت پذیری کے لئے جاتے تھے اور ایک ماہ غور و فکر اور تفکّر میں بسر کیا کرتے تھے ۴۰ عام الفیل میں جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی، سترہ رمضان کی مبارک رات کو آپؐ نے عالم خواب میں محسوس کیا کہ آپ کا قلب ایک تصور سے منور ہو رہا ہے۔ اور کوئی طاقت آپ سے کہہ رہی ہے کہ زندگی کی جتنی پیچیدگیاں ہیں وہ ان دو حقیقتوں کی روشنی میں رفع ہو جاتی ہیں کہ

(۱) **حقیقت وجود یہ ہے** کہ ایک خالق ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے وہی تیرا رب (آقا) ہے۔ یعنی خالق و مخلوق الگ الگ وجود رکھتے ہیں اور روح و مادہ دونوں کا وجود خالق سے ہے۔

(۲) **حقیقت علم یہ ہے** کہ اس آقا نے قلم (یعنی تجربہ و مشاہدہ) کے ذریعے سے انسان (آدم) کو ان باتوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتا تھا (یعنی حیوان سے انسان بنا دیا اور عقل و ہوش عطا کیا تاکہ قلم سے اپنے علوم و تجربات کو ایک دوسرے تک پہنچائے اور ساحروں کی طرح شیطانی کام نہ کرے کہ ہر بات خفیہ اور راز ہو۔ اور یہ اس کی انتہائی مہربانی ہے کہ اس نے عقل و شعور بخشا جو انسان کا ذریعہ علم بنا۔ (وعلم آدم الاسماء کلھا)

ان دو حقیقتوں کے دو سلبی پہلو بھی ہیں یعنی :۔

(۱) خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا یا آقا یا خالق نہیں ہے۔ وہ یکتا و یگانہ و بے مثال ہے۔

(۲) خدا اکرم ہے۔ یعنی دوسرے آقاؤں کی طرح ظالم یا خود غرض نہیں ہے اس کے کرم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان کے نفع کے لئے اسے صاحب عقل و شعور بنایا اور اپنی بارگاہ سے علم عطا فرمایا۔ کوئی

دوسری ہستی (مثل شیطان یا وسوسۂ فاسدہ کے) ایسی نہیں ہے (جیسا کہ پروہت و کاہن کہتے ہیں) جو سچا علم یا سچی خبر دے۔ سچے علم کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ علم راز میں نہ رکھا جائے اور اس کو ذاتی منفعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ بالفاظ دیگر سچا علم خدا کی طرف سے عام انسانی فلاح کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو علم بھی ہے وہ فریب دہی اور ذاتی نفع کا ذریعہ ہے اور یقیناً وسوسۂ شیطانی سے پیدا ہوتا ہے اور آخر کار معلم و شاگرد دونوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

نوٹ:- (۱) ابتدائی وحی میں جسے انسان کہا ہے، اُسی کو بعد میں آدم سے مخاطب کیا ہے۔

(۲) جس چیز کو اس وحی میں علم کہا ہے، اُسی کو بعد میں کتاب و حکمت بھی بتایا ہے۔

سورۃ العلق کی پانچ آیتوں کے الفاظ کی تشریح

ہم نے قرآن کو ترتیب تنزیل کے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے وہ مفسر جو تفسیر بالرائے کرتے ہیں، یا کسی مفسر بالرائے کی پیروی کرتے ہیں وہ بسا اوقات عربی الفاظ کے ان معنوں سے دور ہو جاتے ہیں جو آنحضرتؐ کے زمانے میں رائج تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم کے حقیقی و بنیادی خط و خال ان لوگوں کی آراء کے پردوں میں چھپ جاتے ہیں اور ان خام بنیادوں پر جن عقائد کی دیوار چُنی جاتی ہے وہ خطرناک ہو جاتی ہے اور نہ صرف معمار کو بلکہ اس مکان کے مکینوں کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔

انسان کی دینی اور تمدنی کش مکش: دنیا میں ہر قسم کے مذہب پھیل چکے تھے اور ہر مذہب میں متعدد فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اور ایک مذہب دوسرے مذہب کو مردود قرار دے رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہب عقل بھی اپنا کام کر رہا تھا، یعنی جنگ یا تجارت کے سلسلے میں جب ایک قوم دوسری قوم سے ملاقی ہوتی تھی تو ایک دوسرے کی بہت سی اچھی باتوں کو قبول کر لیا کرتی تھی اور اپنے قومی مذہب تمدن کی عزت بھی یہ کہہ کر قائم کر لیا کرتی تھی کہ یہ بات ہمارے مذہب یا تمدن نے ہی دوسروں کو سکھائی ہے۔

توہمات اور شیطانی الہامات انسانی عقلوں پر پردہ ڈالنے والے گروہ، مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ پروہت، ساحر، کاہن اور شاعر سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ علم و ادب، مذہب و عقل صرف ان کی

جماعت کی میراث ہے۔ اور نہ تو دیوتاؤں کے خوش کرنے کا راز کسی غیر آدمی کو معلوم ہونا چاہیئے اور نہ اُس فن کے استعمال کا کسی غیر بے دہمت کو حق ملنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیوتاؤں کے نام پر نذر نیاز اور قربانیاں ہی نہیں وصول کی جاتی تھیں، بلکہ یہ کوشش بھی جاری تھی کہ لوگ قدامت پرست رہیں، اور علم و ہنر کی روشنی سے محروم رہ کر ذہنی اجارہ داروں کے غلام بنے رہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس منظم مذہبی گروہ کے خلاف آواز بلند کرتا تھا تو پہلے تو سوسائٹی سے بے دین و کافر بنا کر نکال دیا جاتا تھا اور اگر پھر بھی باز نہ آتا تھا تو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر کسی وجہ سے اس طرح کے "بے دینوں" کا مذہب ترقی پا جاتا تھا تو اس کے خلاف ایک مستقل محاذ بن جاتا تھا۔

یہودی اگرچہ تباہ حال تھے مگر ان میں متعدد فرقے بن گئے تھے اور خصوصیت سے صدوقی و فریسی بعث بعد الموت کے انکار و اقرار پر ایک دوسرے کو کافر بنا رہے تھے۔ یہی حال ہند میں تھا۔ بُدھ اور مہاویر نے جب برہمن سوسائٹی کے خلاف آواز بلند کی اور ویدوں کی بعض باتوں کو جھٹلایا، یا کہا کہ نہ زہد اور سنیاس سے نجات حاصل ہو سکتی ہے نہ بام مارگیوں کی طرح عیاشی و لذت پرستی سے کچھ ہو سکتا ہے بلکہ عقل کے بتائے ہوئے رستے پر اعتدال سے چل کر زندگی کا سوال حل کیا جا سکتا ہے تو خونی قربانیوں سے پیٹ بھرنے والوں نے سخت احتجاج کیا اور جب بدھ ست دھرمیوں (عقل پرستوں) کی کثرت کے آگے کچھ نہ چلی تو بدھ مذہب کو عوام سے دور کرنے کے لئے بدھ کی تعلیم کو عوامی زبان کی جگہ سنسکرت (خفیہ اور خاص زبان) میں منتقل کر دیا۔ تاکہ سمجھانے والے صرف بے دہمت رہ جائیں۔ پھر پورے ہند سے بدھ اور جین دھرم کا خاتمہ کر دیا۔ ایران قدیم میں بھی یہی ہوا کہ دو فرقے بن گئے اور ایک کے

خدا کو دوسرا فرقہ شیطان کہنے لگا۔ اسی لئے مزدا پرستوں کا آہورا ہند والوں کا آسورا یعنی دیوتا بن گیا۔ اور ان کا دیو ہند والوں کا خدا یا آسور اقرار پایا۔

جس طرح بدھ مذہب نے ہند میں سوشل انقلاب کی بنیاد رکھی تھی اسی طرح مزدک نے ایران میں کام شروع کیا تھا۔ وہاں بھی نتیجہ وہی ہوا کہ وہ، اور اس کے ساتھی زندہ درگور کردیئے گئے۔ اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لئے کئی پیغمبر پیدا ہوئے اور قتل کئے گئے۔ اور آخر کار مسیح کے ساتھ جو ہوا وہ دنیا پر روشن ہے۔

اگرچہ یہودیوں نے مسیح کو نہ مانا لیکن اسکندریہ کے فلسفیوں نے انھیں خدا بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فرقے جو مسیح کو خدا نہیں مانتے تھے مردود و ملعون قرار دیئے گئے۔ مثلاً سابلی فرقہ کہتا تھا خدا تو ایک ہی ہے لیکن تثلیث کے تینوں عنصر اس کے تین اوصاف ہیں۔ آریوس مسیح کو خدا کا بیٹا تو مانتا تھا لیکن اصلی خدا یعنی "باپ خدا" کو زمانے کے اعتبار سے پہلے اور "بیٹے خدا" کو بعد کے زمانے کا تسلیم کرتا تھا۔ اس بردہ کا فر بنادیا گیا۔ نسطوریوں کی ایک شاخ "یونی تی" تھی جو کہتی تھی کہ پیدا ہونے سے پہلے مسیح خدا تھا۔ لیکن جب اس نے اوتار کے طور پر دنیا میں جنم لیا تو وہ انسان بن گیا۔ نسطوری فرقہ کرتا تھا کہ مسیح کی فطرت دوگونہ ہے اس کی نیچر خدائی بھی ہے اور انسانی بھی۔ یعنی وہ آدمی ہے۔ وہ مریم کو خدا کی ماں نہ مانتا تھا بلکہ ایک انسان کی ماں سمجھتا تھا۔ یہ فرقہ شام عرب اور عراق میں پھیلا ہوا تھا۔

یعقوبی بھی نسطوری تھے، یہ بھی عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ "یک آدمی" یعنی توحید جسم و روح کے ماننے والے (Mono phhysisist) کہتے تھے کہ خدا اور مسیح کی نیچر ایک ہی تھی۔ نصاریٰ، جن کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے، عیسائیوں کے خاص فرقے یعنی "نصرانی" سے تعلق رکھتے تھے۔ درحقیقت یہ یہودی تھے۔ حضرت عیسےٰ کو مسیح مانتے تھے اور کہتے تھے کہ مسیح کا باپ

روح القدس تھا اور ماں مریم عذرا تھیں۔ ان کے خیال میں مسیح میں الوہیت کی کچھ صفتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ نصرانی سب باتوں میں موسوی قانون یعنی توراۃ و شنع کے پیرو تھے۔ ان ہی کے مانند ابیونی تھے جو مسیح کو بہت بڑا پیغمبر اور انسان مانتے تھے۔ مریم سے پیدا ہونے والے مسیح کے وجود کے قائل نہ تھے یہ بھی کافر کردئے گئے تھے اور عرب میں موجود تھے۔ ایک اور "کافر" فرقہ مریمی تھا جو مریم کو کنواری ماں کر کے انھیں بھی بجائے روح القدس کے خدا مانتا تھا۔ اس طرح ان کی تثلیث (باپ۔ بیٹا اور مریم) تین خداؤں کے اشتراک پر مشتمل تھی۔ غرضکہ نہ صرف تثلیث کو توحید ثابت کرنے اور تثلیث کے مختلف اقنوموں کی ماہیت معلوم کرنے کی کوشش جاری تھی، بلکہ جو شخص یا فرقہ ذرا بھی کلیسا کے پوپوں کے بنائے ہوئے عقیدہ سے منحرف ہوتا تھا وہ کافر و ملعون قرار دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ جو دلیلیں پیش کرتے تھے اور جس طرح تثلیث کو توحید کا رنگ دیتے تھے انھیں سُن کر ایک بچہ بھی ہنس پڑے لیکن ان دلائل کو بزور شمشیر منوایا جاتا تھا۔ اور جان کے خوف سے ان کے خلاف کوئی ایک لفظ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سلسلے کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ شیشے کے اندر سے روشنی یا نور گزر جاتا ہے اور شیشہ جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ چونکہ خدا نور ہے، اس کا نطفہ بھی نور ہے، اور جو چیز اس سے پیدا ہو وہ بھی نور ہے، اور خدا ہے جب مریم خدا کے نور سے حاملہ ہوئیں تو خدا کا بیٹا بھی نورانی شکل میں مریم کے پیٹ میں رہا۔ پھر جب پیدا ہوا تو نورانی شکل میں ظاہر ہوا اور مریم کنواری کی کنواری رہیں یعنی شعاع نور نے شیشۂ بکارت کو بغیر توڑے ظہور کیا۔ یہ عقیدہ اب تک سپین کے رومن کیتھولک فرقے میں موجود ہے کہ مسیح نور ہیں اور مریم اُم النور ہیں جو باپ "نور" سے پیدا ہوئے ہیں اور مریم پھر بھی کنواری ہیں۔"

یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ مندرجہ بالا منطق ٹھیک ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ خدا کے باپ اور مریم کے ماں ہونے کا تصور کس غلط تعبیر سے ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کل زبانیں مجموعہ ہیں اُن الفاظ و محاورات کا جو مرورِ زمانہ کے بعد ایک خاص نہج اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے معانی مستعار لے لیتے ہیں جو ان کے ابتدائی یا لغوی معنی نہیں ہوتے۔ مثلاً باپ اسے کہتے ہیں جو کسی بیٹے کو پیدا کرے اور اس بیٹے کی ماں کا شوہر ہو۔ بیٹا اسے کہتے ہیں جو باپ سے پیدا ہو اور اس سے سن میں چھوٹا ہو۔ اسی طرح بہت سے انسانی رشتے ہیں جن کے ہر زبان میں لغوی معنی کچھ اور، اور تشبیہ و استعارہ کے طور پر مجازی معنی کچھ اور ہیں۔ مثلاً

عربی: اِبن ۔ بِنت ۔ اَخ ۔ اُم ۔ اَبْ

ابن آدم ۔ انسان
ابن الہلاک ۔ ملعون
ابن السبیل ۔ مسافر
ابن آدی ۔ گیدڑ
ابن یومہ ۔ بے پرواہ
بنو عم ۔ رشتہ دار
بنو المدینہ ۔ شہری
بنو اللیل ۔ چور
ابن الوقت ۔ خوشامدی
ابنائے جنس ۔ ہم جنس
ابنائے عصر ۔ ہم زمانہ
بنت الشفہ ۔ کلمہ

بنت العین ۔ آنسو
بنت العنب ۔ شراب
بنت الفکر ۔ خیال
بنت الماء، بنت البحر } جل پری
بنات الارض ۔ ندی
بنات اللیل، بنات الصدر } افکار
بنت النیل ۔ مصری عورت
بنت حوا ۔ عورت
اخو الحزم ۔ محتاط آدمی
اخوان الشیاطین ۔ بدمعاش

اخوان الصفا ۔ پاک طینت
اخی ۔ شوہر
ام القُریٰ ۔ مکہ
ام القِریٰ ۔ آگ
ام الراس = دماغ
ام النور ۔ مریم [۴]
ام النجوم ۔ کہکشاں
ام عامر ۔ بجو
ام الشی ۔ اصلہ
ام الکتاب ۔ کلام الٰہی
ابو جابر ۔ روٹی
ابو الحارث ۔ شیر

ابوالحصین - لومڑی	ابوالشیطان - مرغ سحر	ابوالوقت - عبقری
ابوالنوم - افیون	ابوالنظارہ - عینک لگانے والا	ابوتراب - خاکسار حضرت علیؓ
ابوالہول - مجسمہ مصری	ابولمعہ سُکّر - چمکدار چینی	

فارسی :-

بچہ سگ - پاجی - احمق	پدرکش } پاجی	مادر زاد - پیدائشی
بچہ نو - کلی - حادثہ	پدرسوختہ } پاجی	خاتون عرب - کعبہ

انگریزی :-

انسان کا بیٹا - مسیح	شیطان کا بچہ - پاجی	باپ کا ملک - وطن
بیٹا - مسیح	جہنم کا بچہ - جہنمی	ماں کا ملک - وطن
سفید مرغی کا بچہ - خوش قسمت	بک بک کا بچہ - وکیل - بیرسٹر	کتیا کا بچہ - حرامی
اپالو کا بیٹا - پنڈت - عالم	موم کا بچہ - موچی	بندوق کا بچہ - حرامی
مریخ کا بیٹا - سپاہی	مقدس باپ - پوپ	کنوارے کا بچہ - حرامی

ہوا یہ کہ قدیم سامی زبانوں میں ابن اللہ اللہ والے یا اچھے آدمی کو کہتے تھے جیسا کہ ابن الشیطان بدمعاش کو اور ابن الحیّہ چالاک کو کہتے تھے۔ جب اس لفظ کا یونانی بائبل والوں نے یونانی ترجمہ کیا تو بالکل لغوی کردیا اور اس کے مجازی معنی کو چھوڑ کر حقیقت میں اللہ کو باپ اور مسیح کو بیٹا اور ام مریم کو مسیح کی ماں نہیں بلکہ اللہ کی ماں قرار دے دیا۔

اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عرصہ دراز تک ایک مسیحی فرقہ دوسرے فرقے کو محض اس لئے کافر کہتا رہا کہ ایک حضرت مریم کو مسیح کی ماں کہتا تھا اور دوسرا اس بات پر زور دیتا تھا کہ مسیح انسان نہیں تھے بلکہ خدا کا نور تھے اور خدا تھے۔ لہٰذا حضرت مریم کو خدا کی ماں نہ کہنا کفر ہے۔ اسی لغوی ترجمہ

کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے والوں نے اس مسئلہ کو بھی حل کرنے کی کوشش کی کہ بچہ ہونے کے بعد حضرت مریم کیونکر کنواری کی کنواری رہیں اور انہوں نے روشنی اور شیشہ کی مثال سے بزعم خود اسے حل بھی کر دیا.........غرضکہ ایک محاورہ کے غلط ترجمے نے کروڑوں انسانوں کو ایک ایسے مغالطہ میں مبتلا کر دیا کہ یا تو وہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا ملحد ہو جاتے اور دین مسیح کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بار بار قرآن نے یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم تھے، ابن اللہ بمعنی "خدا کا بیٹا" نہ تھے۔ اسی لئے جو لوگ اہل باطن یا اہل دل تھے۔ انہوں نے عوام الناس کی کفر سازی سے مجبور ہو کر حقیقت دین کو مجاز کا جامہ پہنا کر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ شاید حافظ نے اسی لئے کہا تھا کہ:۔ ؎

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند
پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند
مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب
چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

یعنی مے نوشی وہ بے خودی پیدا کرتی ہے کہ جو لوگ دین کو دام تزویر بنائے ہوئے ہیں ان سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے اور خود پرستی کے دھبوں کو ایک جرعہ سے اس طرح دھو دیتا ہے کہ ریا کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ حافظ نے جو بات کسی قدر الہامی زبان میں کہی تھی کہ ؎

حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

اسے خیام نے زیادہ واضح کر دیا ؎

من بادہ خورم، ولیک مستی نکنم
الا بقدح دراز دستی نکنم
دانی غرضم زمیں پرستی چہ بود؟
تا ہمچو تو۔ خویشتن پرستی نکنم

لہذا حقیقت قرآن تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ تمدن قبل اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس زمانے کی

معاشرت نے کن کن محاورات کو پیدا کیا تھا اور عربی زبان بولنے والے ان کا کیا مفہوم لیتے تھے۔ موجودہ عہد کی اصطلاحوں کو قدیم اصطلاحوں پر چسپاں کرنا ایک دام تزویر ہے جس سے ہر عقلمند انسان کو نکل جانا چاہیئے۔

اب ہم سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے چند الفاظ سے بحث کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کا سلفی مفہوم کیا تھا اور بعد میں آنے والوں نے ان کو کیا سے کیا کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "ابن اللہ" کے لفظی ترجمہ کی طرح کسی اصطلاح کی خشت اول ہی کج رکھی گئی ہو، اور ثریا تک دیوار میں کجی باقی رہ گئی ہو۔

۱- اِقرأ سامی زبان کا لفظ ہے۔ اور چونکہ تمدن اور تحریر کو افریقہ اور یورپ تک فونیقی قوم نے پہنچایا جو سامی النسل تھی، اس لئے یوروپین زبانوں میں بھی قرأ کا لفظ پہنچ گیا۔ ۸۰۰ھ ق۔م میں قرطاجنہ (Carthage) اور اس سے بہت پہلے طائر کا شہر تعمیر ہو چکا تھا۔ اسی فونیقی قوم نے یونانیوں کو ابجد سکھائی اور سیکڑوں سامی لفظ یورپ پہنچ گئے۔ فرانسیسی میں ایکرے (ECRE) لکھنے کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں کرائی (CRY) پکارنے یا چلانے کو کہتے ہیں۔ عبرانی میں تین معنی ہیں: پڑھنا یا بولنا، وعظ و نصیحت کرنا؛ اور عبادت یا پوجا کرنا۔ یہودیوں کے کاتبوں کو "قرائی" کہتے ہیں۔ اس لفظ کے ابتدائی معنی حمد و ثنا کرنا، یا وعظ و پند کے لئے زبان کھولنے کے ہیں۔ عربی میں اس کے معنی بولنے کے ہیں۔ (یہ ضروری نہیں کہ لکھی ہوئی چیز سامنے ہو اور اس کو پڑھے۔ لہذا اس کا ترجمہ پڑھنا بمعنی کسی لکھی ہوئی کے پڑھنے کے درست نہیں) سنسکرت میں کارو (گانے والا) کری (حفظ کرنے والا) کیرتی (شہرت دینا) کیرتن (کسی کی تعریفیں گانا) بھی قرأ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ سورۃ العلق میں اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، یعنی بولو،

یا حمد و وعظ کرو۔ بولو سے مراد یہ ہے کہ اسم رب سے بولنے کی ابتدا کرو۔ یعنی اللہ کے نام سے بولنا شروع کرو یا اپنے رب کے نام سے حمد و وعظ شروع کرو۔ اس طرح اقرأ باسم ربّ کو الحمد للہ ربّ العٰلمین کا مترادف بھی کہہ سکتے ہیں اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم میں اس کا پورا مفہوم آجاتا ہے۔

۲۔ رب دنیا میں غلامی و خواجگی کا نہایت قدیم زمانے سے چلن تھا اس لئے عربی زبان میں بھی اس تصور کو ظاہر کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تھے۔ غلاموں کے آقا کو "رب" کہتے تھے۔ اس کا ایک ترجمہ "مالک" بھی تھا۔ اس لئے کہ غلام یا "عبد" رب کی نسبت سے عبد، اور مالک کی نسبت سے مملوک کہلاتا تھا۔ رب یا آقا کو عربی میں صاحب بھی کہتے تھے اسی طرح بابلی سامی زبان میں رب کو "بعل" بھی کہتے تھے۔ عربی میں "بعل" کے معنی شوہر، مالک اور آقا کے ہیں۔ قدیم بابلی و فونیقی اقوام بعل (سورج) اور اِشتر (چاند) کی پرستش ہوتی تھی اور سورج یا البعل کو "رب السماوات" کہا جاتا تھا۔ بعل یا شمس پرستی یہودیوں میں بھی جاری تھی اور تاریخ یہود میں اسی بت پرستی کو زوال سلطنت یہود کی ایک وجہ بھی قرار دیا ہے (سلاطین باب ۲)۔ ایران میں بعل کو خورشید، ہند میں سوریہ اور روی، مصر میں را اور عزیرس کہتے تھے۔ اور اب تک پارسی، ہندو اور بعض یہودی (اسینی) سوریہ (سورج) کی بندگی کرتے ہیں۔

رب، را۔ روی، خور وغیرہ میں حرف را پایا جاتا ہے۔ اور عربی فقہ اللغہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ حرف را جن لفظوں میں پایا جاتا ہے اُن میں علو اور بلندی کے معنی ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لئے رب کے معنی

سلطنت کرنے والے آقا کے بھی ہیں۔

عربی میں رب الفرس (گھوڑے کا مالک)، رب البیت (مکان کا صاحب یا مالک)، رب النوع (نوع کا آقا) عام طور پر مستعمل ہے اور ہر جگہ آقا، خواجہ، یا صاحب و مالک کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

آقا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مملوکہ شے کی تربیت بے غرضی سے کرے، اور اس کی نگہداشت میں صرف ملک یا عبد کی بھلائی پیش نظر رکھے اسی لئے جتنے آقا یا مالک ہوتے ہیں ان کو کسی حال میں اکرم نہیں کہا جا سکتا بہت ممکن ہے کہ وہ کریم ہوں لیکن رحمدل آقا بھی بے غرض نہیں ہو سکتا وہ اپنے عبد، یا گھوڑے، یا مکان کو بہتر حالت میں اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے فائدہ اور آرام حاصل کرے۔ کسی آقا یا رب کو بے غرض نہیں کہا جا سکتا البتہ اگر وہ اپنے عبد کو آزاد کر دے، یا اس کے لئے آزادی کی کوشش کرے تو یقیناً وہ رب کریم و رحیم کہا جا سکتا ہے۔ البتہ صرف ایک آقا ایسا ہے جو اکرم ہے اور بے غرض ہے۔ وہ اللہ ہے۔

۳۔ خَلَقَ

(خَلْقاً و خِلْقَةً) = پیدا کرنا۔ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا بنانا (بَرَأَ)۔ آفریدن و ساختن۔ نرم و ہموار کردن۔

خَلْقٌ :۔ مخلوقات۔ لوگ۔ مجمع۔ فطرت۔ ایجاد۔

بائبل کی پہلی کتاب (سِفر) تخلیق کائنات کی کہانی تکوین سے شروع ہوتی ہے۔ اور بعد کی کتابوں میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔ خدا نے پہلے آسمان و زمین بنائے۔ پھر روشنی بنائی، اور خشکی سے تری (سمندر) کو الگ کیا۔ جس میں سبزی اور پھل کے درخت پیدا کئے۔ سورج۔ چاند۔ ستارے پیدا کئے تاکہ زمین پر روشنی ڈالیں۔ پھر مچھلیاں اور پرندے، درندے اور مویشی پیدا کئے اور اس کے بعد انسان کو اپنی مانند بنایا اور اسے ہر جاندار پر اقتدار عطا کیا۔ چھ دن میں تکوین کا کام پورا کر کے خدا نے ساتویں دن آرام کیا۔

یوروپین محققین کا خیال ہے کہ توراۃ کی کہانی، بابلی کہانی سے ماخوذ ہے (دیکھئے اس لینگڈن کی بابلی رزمنامہ تکوین۔ آکسفورڈ ۱۹۲۳ء)۔ اور خود یہ کہانی اس سے پہلے کی سُمیری قوم کی کہانی سے لی گئی ہے۔ اس میں دیوتاؤں کی لڑائی۔ تخلیق کا کام اور پھر طوفان کا قصہ بہت کچھ تورانی کہانی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ رزمنامہ نوروز بابلی میں پڑھا جاتا تھا اور اس کا بعد کے سامی مذاہب پر کافی اثر پڑا ہے۔

قرآن نے بائبل کو کتاب اللہ مانا۔ اور جزئیات توراۃ کی اکثر جگہ اصلاح کردی ہے۔ تخلیق کائنات کے سلسلے میں قرآن بائبل کے اس بیان کی پُرزور تائید کرتا ہے کہ کائنات اور انسان کا خالق اللہ ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ خدا کام کرتے کرتے تھک گیا۔ اور ساتویں دن اس نے آرام کیا' اس سے انکار کرتا ہے۔ نہ وہ تورانی مدارج حیات پر زور دیتا ہے۔ وہ صرف اس بات میں توراۃ کی تائید کرتا ہے کہ خالق کائنات اللہ ہے۔ نہ یہ خود بخود پیدا ہوئی اور نہ کوئی دوسرا خالق اُس کا ہوسکتا ہے۔

ایرانی مذاہب میں، خصوصاً مذہب زرواشتر میں بھی اہورامزدا خالق کائنات مانا گیا ہے اور قرآن کی طرح اسے پادشاہ (ملک) عالم غیب و شہود مانا ہے۔ اہورا کے معنی ہیں خداوند روح حیات، اور مزدا کے معنی ہیں دانا۔ یعنی خداوند بزرگ و دانا۔ اسی کو آفرینندۂ جہان بھی کہا ہے۔ گاتھا میں اسے "ہستی بخش" یعنی "خالق" اور ذات واجب الوجود یکتا اور منزہ از تعین مکان بتایا ہے۔

قرآن نے آگے چل کر اس بات کو بھی صاف کردیا ہے کہ وہی خالق جو کل عناصر کائنات کا خالق ہے۔ اس کا مدبر بھی ہے۔ اور درجہ بدرجہ ترقی دیتا ہے۔ اسی کو ارتقا بھی کہہ سکتے ہیں لیکن خلق اور ارتقاء دونوں کو چلانے والا وہی ہے۔ وہی ان عناصر و ارواح میں ایسی فطری استعدادیں دیتا ہے

کہ وہ صوری و معنوی حیثیت سے ترقی کرتی ہیں۔ الا لہ الخلق والامر (اعراف ۵۴)
سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ پھر قرآن اس پر بھی زور دیتا ہے کہ مختلف
انسانوں کی غیر علمی اور خرافات باتوں کو نہ مانو، بلکہ تجربہ و مشاہدہ کو دلیل
راہ بناؤ۔ (ویتفکرون فی خلق السموٰات والارض) سے اسی طرف اشارہ ہے۔
الذی خلق: خلق کرنے والا یا خالق۔ یہاں عام آقاؤں سے ممتاز کرنے
کے لئے ایسی صفت بطور "فصل" کے بیان کی گئی ہے جو کسی دنیوی آقا میں
نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے الذی کے لفظ کا استعمال ہوا تاکہ جملہ زوردار بھی
ہو جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ اور کوئی رب یا آقا نہیں ہے جو
"خلق" کر سکے۔ پھر اس بات پر بھی زور ہے کہ کائنات کا ایک خالق ہے
یہ دنیا خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ خلق کی گئی ہے۔ یہاں اس سے بحث
نہیں کہ دنیا میں مادہ اور جاندار ترقی یا تنزل کر رہے ہیں یا نہیں۔ ارتقا
کی بحث سے پہلے تخلیق کی بحث آتی ہے۔ اور صاف صاف جزم و
یقین کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ایک خالق ہے جو مخلوق کو خلق کرتا ہے۔
اور یہ دنیا مشین کی طرح خود بخود نہیں چل رہی، بلکہ ایک خالق ہے جو
کسی مقصد کے لئے اسے چلا رہا ہے۔ یعنی وحی اول کی پہلی ہی آیت
نظریہ مشینیت (Mechanism) کی مخالف ہے۔ اور غایتیت
(Teleology) کی تعلیم دیتی ہے۔

۴۔ انسان: انسان بروزن فعلان اپنی اصل پر ہے۔ الانس ضد ہے
جن کا۔ اور انسی ضد ہے وحشی کا۔ اس کے معنی ہیں آدم
یا بشر۔ آنکھ کی پتلی کو انسان العین کہتے ہیں۔ اس کی جمع اناس و اناسی ہے
اس میں سے الف کو حذف کر کے اس کی جگہ "ال" لاتے ہیں۔ (انسان بمعنی آدم)
انسانیت کے عربی معنی مروت، مردمی، بہادری یا خوش اخلاقی و
شرافت کے ہیں۔ گویا وہ آدمی جو محبت، بہادری، مروت و خوش اخلاقی

کی صفات رکھے وہ انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ بقول غالب ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۵۔ **علق** : کے معنی لگاؤ۔ محبت، اُنس، اور خون کی پھٹکی کے ہیں۔ اسی نے علوقہ کا لفظ بمعنی جونک کے ہے۔ رحم مادر میں نطفہ کی ابتدائی شکل ایک کیڑے کی سی ہوتی ہے جو ابتدا میں جونک کی شکل کا ہوتا ہے۔ موجودہ علم حیاتیات نے ثابت کردیا ہے کہ جانوروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو انڈے سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نطفہ یا علق سے رحم مادر میں پرورش پاتے ہیں اور ماں کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دودھ پلانے والے جانوروں کو اپنے بچے سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ انڈے سے پیدا ہونے والے جانور نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات خود ماں اپنے انڈوں اور ننھے بچوں کو کھا جاتی ہے۔ غرضکہ علق اور انسان میں جو بلاغت ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے علق یعنی انس و محبت سے انسان کا خمیر بنایا۔ (بخلاف جانّ یا سانپ کے)

۶۔ **اکرم** : کریم کا صیغہ افضل التفضیل ہے۔ کَرُم، کَرّم و اَکرم۔ عزت دینا شرف بخشنا۔ کریم جوانمرد و فیاض کو کہتے ہیں۔ اس فیاضی و مہربانی میں رحم و بے غرضی داخل ہوتی ہے۔ اسی لئے کرم ایسی فیاضی کو کہتے ہیں جس میں شرافت پائی جائے اور دینے والے کو بدلے کی خواہش اور ضرورت دونوں نہ ہوں۔ حجر کریم قیمتی جواہر کو، کرم۔ انگور اور باغ کو، حصان کرم شریف النسل گھوڑے کو اور دمٌ کریم شریف النسل انسان کو کہتے ہیں۔ وجہ کریم حسین و وجیہ چہرے کو اور الکریمتان آنکھوں کو بولتے ہیں۔ غرضکہ اس مادے سے جو لفظ بھی بنتے ہیں ان میں حسن و خوبی کی شان پائی جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اخلاق فاضلہ کے لئے

بہترین لفظ کرم ہے۔

۷۔ **علم** ۔ معرفت یا جاننے کو کہتے ہیں، جو جہل یا نادانی کی ضد ہے اور علمی ضد ہے نظری کا۔ موجودہ زمانہ میں علم سائنس کو اور علمی سائنٹفک (SCIENTIFIC) کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

علم ہی سے علامت کا لفظ ہے جس کے معنی اشارہ ہیں۔ گویا اس لفظ میں وحی و الہام کا اشارہ موجود ہے کہ حقیقی علم و ادراک کا تعلق ذہن و حواس باطنی سے ہوتا ہے اور وہ علم ایک اشارہ خفی یعنی وحی و الہام کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔

وہ علم جو بذریعہ قلم خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے وہی حقیقی علم ہے۔ دوسرے علوم (شعر و سحر و جوتش و کہانت) جو راز میں رکھے جاتے ہیں اور سائنٹنک تنقید کی کسوٹی پر نہیں کسے جاتے وہ سب شیطانی ہیں اور علم کی ضد یعنی جہل ہیں۔ قرآن کی یہ آیت انسان کو حقیقی علم کی طرف لے جاکر جہل و ظلم کی تاریکی سے نکالنا چاہتی ہے۔

آگے چل کر اسی علامت یا نشان کے لئے قرآن میں آیت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چونکہ علامت دلیل کو بھی کہتے ہیں اسی لئے آیت کے معنی بھی دلیل و برہان کے ہیں۔

علم کا تعلق قلم سے ہے اور قلم بھی علامات بناتا ہے، جن سے لوگوں پر خفیہ علوم آشکارا ہوتے ہیں اور وہ ہدایت پاتے ہیں۔

۸۔ **قلم** : قلم خامہ کو بھی کہتے ہیں جس سے لکھتے ہیں اور علامتیں یا نشان بناتے ہیں۔ یہاں لطیف اشارہ علامت و آیت سے ہے آیات اُن دلائل کو بھی کہتے ہیں جن سے ایک جاہل آدمی بھی "خالق کائنات" کو پہچان لے۔ گویا قلم بھی ایک ذریعہ وحی ہے۔ اور وحی خود آیات یا دلائل پر مبنی ہے جس سے انسان وجود حقیقی کی معرفت (علم) حاصل کرتا ہے۔

حروف مقطعات یعنی ابجد

ان آیات میں جن چند الفاظ کا استعمال ہوا ہے ان پر غور کیا جائے تو قرآن کریم کی وہ بحثیں جو عدم ترتیب تنزیلی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں وہ سب حل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حروف مقطعات ہی ذریعۂ علم ہیں لہٰذا ذٰلک الکتاب یا تلک الآیات میں اشارہ ان ہی حروف ابجد کی طرف ہے جن سے علم حقیقی کے الفاظ و بیانات بنتے ہیں اور جو سحر کی طرح مبہم یا کہانت وغیرہ کی طرح شیطانی نہیں ہوتے۔ الم ذلک الکتاب اور المر تلک الآیات اور ن والقلم وما یسطرون میں جتنے حروف ابجد ہیں وہی ھدی للمتقین، آیات الکتاب اور کلام من عند اللہ ہیں۔ اسی لئے علم بالقلم یعنی علم مکتوبہ کو خدائی علم یا وحی کا درجہ دیا گیا۔

قرآن کی ابتدائی تعلیم ہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے

یعنی سورہ ۹۶۔ العلق

اب ہم سورۃ العلق (۹۶) کی اُن پانچ آیتوں پر غور کرتے ہیں جن کے متعلق ہر محدث و مؤرخ بالاتفاق یہ کہتا ہے کہ یہی پانچ آیتیں ہیں جو سب سے پہلے رسول عربیؐ پر نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ آیتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر محض سطحی طور پر گزرا جائے اور ترتیب مباحث قرآن کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتیں اُمّ القرآن ہیں

فرض کیجئے کہ اسلامی تعلیم صرف ان پانچ آیتوں تک محدود ہوتی، اور اس کے بعد رسول عربیؐ کے ذریعے سے انسان کو کوئی پیغام نہ دیا جاتا، تو کیا یہ اسلامی پیغام کو پورے طور پر دنیا والوں تک پہنچانے کے لئے کافی تھیں ہم کو یقین ہے کہ یہ آیتیں بالکل کافی تھیں، اور بعد میں جتنا قرآن نازل ہوا، ان ہی

آیتوں کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتا رہا ہے۔ اصل حقیقت وہی رہی جو اس پیغام میں ہے۔ لہذا اگر ان آیتوں کو وہ خطابات دئے جائیں جو سورۃ الحمد کو دئے گئے ہیں (چونکہ حقیقت میں الفاتحۃ الکتاب یہی آیتیں ہیں) تو زیادہ مناسب اور برمحل ہوگا۔ اسی لئے ان کو الفاتحہ، کنز، کافیہ، شافیہ غرض کہ جو کچھ کہیں بجا ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے یہ آیتیں اسلامی تعلیم میں مرکزی درجہ رکھتی ہیں گویا اسلام کے آنکھیں ہیں۔ اس لئے اسے "عینان انقلاب" کہیں تو بجا ہے۔ اگر مولانا عبیداللہ سندھی نے سورۃ الفتح کا نام عنوان انقلاب نہ رکھ دیا ہوتا تو ہم اسے عنوان انقلاب کہتے۔

ان آیتوں میں زمانہ جاہلیہ کا پورا ذہنی پس منظر موجود ہے

جن دو باتوں پر ان ابتدائی پانچ آیتوں میں زور دیا گیا ہے وہ دو مرکزی یا بنیادی مابعد الطبیعاتی (یا الہیاتی) باتیں ہیں۔ جب سے انسانی سوچ بچار کی ابتدا ہوئی ہے ان ہی دو باتوں پر بحث جاری ہے، یعنی:

(۱) حقیقت وجود کیا ہے (وجودیات)

(۲) علم و فہم انسانی حقیقتاً کس طرح اور کہاں سے حاصل ہوتا ہے (علمیات)

سُورۃ العلق کی پہلی پانچ آیتوں کا مفہوم

(الف) پہلی آیت: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ:

"اپنے اس آقا (رب) کے نام سے حمد یا وعظ و نصیحت (قرأت) بولنا شروع کر، جس نے کل کائنات کو خلق کیا ہے۔"

قرأ سے کسی چیز کو دیکھ کر پڑھنا مراد نہیں۔ اس کے معنی ہم لکھ چکے ہیں۔ حریر پر لکھے ہوئے الفاظ کا پڑھوانا، اور وہ بھی خدا کی طرف سے قطعی سمجھ میں نہیں آتا، جب کہ اللہ کو یہ علم تھا کہ آنحضرتؐ اُمّی تھے، نہ ہم

ان روایتوں کو مان سکتے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ نزول وحی کو آپؐ تو نہیں سمجھے، یا سمجھے تو القائے شیطان سمجھے، اور حضرت خدیجہؓ نے ورقہ بن نوفل نصرانی کے ذریعے آپؐ کو بتایا کہ یہ آسیب، جن یا شیطان نہیں ہے بلکہ فرشتۂ وحی ہے جس نے آپؐ کو دبوچا، اور باوجود اس علم کے کہ آپ پڑھنا نہیں جانتے تھے آپ کو پڑھنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ ان ہی راویوں کی روایت ہے کہ نزول وحی سے پہلے شجر و حجر آپؐ کو نبی کہہ کر سلام کیا کرتے تھے۔

رب یا خالق کا تصور: ان پانچ آیتوں کا روئے سخن خود رسول عربیؐ کی طرف ہے۔ یعنی اس کلام کے دو متکلم ہو سکتے ہیں ایک تو کوئی خارجی طاقت جو انسان کے دل میں خیالات و تصوّرات پیدا کرتی ہے، دوسرے خود رسول عربیؐ اپنے نفس کو مخاطب کرکے گفتگو کر رہے ہوں۔ دونوں صورتوں میں منشائے سخن ایک ہی ہے یعنی خدا کا وہ تصور سامنے لایا جا رہا ہے، جو اس وقت تک عرب اور ملحقہ متمدن ممالک میں عام نہ تھا۔ کہیں خدا کو خالق خیر، اور شیطان کو خالق شر مانا گیا تھا (جیسے مجوسیوں میں) کہیں خدا کا اقرار تھا، لیکن مادّہ کا انکار تھا، یا کم از کم مادّہ کی ازلیت کا انکار تھا (ہندی ویدانت) کہیں خدا اور مادّہ دونوں ازلی قرار دئے گئے تھے یعنی دونوں غیر مخلوق ہیں۔ کہیں خدا کو خالق اور مادّہ کو مخلوق مانا گیا تھا۔ کہیں۔ یا خالق کا انکار تھا اور روح کو بھی مادّہ کے امتزاج کا ایک نتیجہ سمجھا جاتا تھا، جیسے چارواک ہندی (تیسری صدی مسیحی میں) یا دمقراطیس وامپیڈوکلیس یونانی یا موجودہ زمانے کے ملحدین یورپ۔ اور ہند میں جین مت کے بانی مہابیر (۵۹۹ - ۵۲۷ ق م) اور گوتم بدھ نے (دونوں اگرچہ برہمن نہ تھے بلکہ چھتری تھے۔) دونوں نے ویدوں کی بہت سی باتوں کا

انکار کیا اور اوّل الذکر نے خدا کا انکار اور آخر الذکر نے خدا کے متعلق خاموشی اختیار کی۔ یا یوں کہنا بہتر ہو گا کہ گوتم بدھ نے خدا کے مفہوم کو دھرم (دین یا عدل یا فرض) کے لفظ سے ادا کیا۔ اسی کو ہندوؤں نے برہما (یا کلمہ) کہا تھا۔ یونانیوں نے لوگاس (کلمہ یا خیال) اور عربوں نے کلمہ یا حق کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔

پھر ربوں یا الٰہوں کی بہت سی قسمیں تھیں، ار تقسیم عمل کے خیال سے ایک ہی رب سب کام نہ کرتا تھا۔ یعنی پیدا کرنا مارنا، پرورش کرنا مختلف ربوں کے اختیار میں مانا جاتا تھا۔ ان بڑے ربوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے رب بھی ہوتے تھے۔ کوئی بجلی گراتا تھا کوئی پانی برساتا تھا کوئی عشق کی دیوی تھی۔ کوئی دولت کی مالک تھی۔ غرضکہ سیکڑوں قسم کے رب تھے۔

دنیا میں انسان بھی رب یا آقا تھا۔ وہ نہ صرف گھر بار۔ مال دولت بیل گھوڑے کا رب یا مالک ہوتا تھا۔ بلکہ اپنے ہی قسم کے انسانوں کا بھی آقا ہوتا تھا۔ اور انہیں جس طرح چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ ان سب ربوں یا آقاؤں میں ایک وصف مشترک تھا کہ غلام اُنہیں ظالم سمجھتے تھے۔ اور یا تو ان کی غلامی سے قطعی آزاد ہو جانا چاہتے تھے یا اُنھیں بہترین خدمات پیش کر کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنا اور اپنی اولاد کا خون پیش کرنا ایک معمولی بات ہو گئی تھی۔ یعنی دیوتاؤں کو رشوت دے کر خوش کیا جاتا اور جا و بے جا کام لیا جاتا تھا۔

خدا موجود ہے اس وحی میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ رب جو خالق ہے، دوسرے ارباب کی طرح نہیں ہے، جو خلق نہیں کر سکتے یعنی اس کی صفت خالقیت ہی بے مثال صفت ہے۔ اس وحی میں اس کے وجود کا صرف اقرار ہے، یعنی وہ رب موجود ہے، وہ ایک حقیقت ہے۔

آگے چل کر قرآن نے بتایا ہے کہ لیس کمثلہ شئ (اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے) لہٰذا اگر کوئی اس کی حقیقت کو جاننا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ ہمارے حواس نے اس کے مانند کسی چیز کا احساس نہیں کیا، لہٰذا قدرتی طور پر ہم ایسی ہستی کے تصور سے مجبور ہیں جس کو نہ محسوس کر سکتے ہیں، اور نہ اُس کے مانند کسی چیز کو جانتے ہیں۔ وہ بے مثال، بے ہمتا اور یگانہ ہستی ہے۔ ہم اُس کی ذات کے متعلق صرف اُن صفات سے اندازہ کر سکتے ہیں جو عالم محسوسات میں پائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے۔

وہی خالق ہے

ہم مادّہ سے مختلف چیزوں کو بنتے دیکھتے ہیں۔ بادل، درخت، پہاڑ، ستارے سب موجود ہیں، اور محسوس ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کبھی نہ کبھی بنے ہوں گے۔ کیا یہ خود بخود بن گئے؟ فلسفہ کا ایک مذہب جو مشینیت (Mechanism) کہا جاتا ہے وہ اس کا قائل ہے کہ ہاں یہ سب خود بخود بنے ہیں اور مشین کی طرح کسی علت سے چل رہے ہیں۔ فلسفہ کا دوسرا مذہب غایتیت (Teleology) کہتا ہے کہ نہیں ہر شے کی غایت پر نظر ڈالنا ہے یعنی ہر چیز کسی نہ کسی مقصد سے کام کر رہی ہے محض مشین نہیں ہے کہ چلا دی گئی تو بلا غایت و مقصد کے چل رہی ہے۔ کوئی چلانے والا یا خالق ہے جو کسی مقصد کے لئے کل کائنات کو چلا رہا ہے۔

کسی چیز کو نیست سے ہست کرنے، یا عدم سے وجود میں لانے کی صفت کو خلق کرنا کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے اسی طرح اس صفت خالقیت میں یگانہ ہے۔ کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو عدم سے کسی شے کو وجود میں لا سکے۔ ہر چیز مخلوق ہے۔ صرف خدا خالق ہے۔ مخلوق اشیاء سے دوسری چیزیں تیار ہو سکتی ہیں۔ یہ تخلیق نہیں بلکہ صنعت ہے۔ صانع حقیقی یعنی خالق صرف خدا ہے۔ اُسی نے روح اور مادّہ دونوں کو

پیدا کیا ہے، اُسی نے خیر و شر کو روشنی اور تاریکی عطا کی ہے یہ قدرتِ تخلیق کسی میں نہیں، لہٰذا وہی قادرِ مطلق ہے۔ یہ ہے اس بنیادی صفت کا تصور جو خدا کے متعلق محمد عربی ؐ کے دل میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔

اِس تصور کا نتیجہ "بغاوت"

(۱) حقیقی آقا یا رب وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ دوسرے آقا یا رب مجازی ہیں۔ اور خود بھی مخلوق ہیں۔ جب صرف خدا خالق ہے اور سب مخلوق ہیں، تو انسان کو کسی دوسری مخلوق کے آگے سر جھکانے، یا اُس سے مدد مانگنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اُسے ظالم سمجھ کر اس کے لئے قربانی پیش کرنے کی حاجت ہے گویا یہ تصور دوسرے ربوں اور خود اپنے نفسانی دیوتا (الٰہہ ہواہ) کے خلاف اعلان "بغاوت" ہے۔

(۲) جب کل انسانوں کا ایک ہی خالق ہے، تو مخلوق ہونے کی حیثیت سے سب انسان اُسی کے بندے ہیں، اور اس حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ خدا کے بندے کو اپنا بندہ یا غلام بنائے۔ ہر شخص کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور ہر شخص کے حقوق مساوی ہونا چاہیئں۔

(۳) چونکہ ہر شے خدا کی پیدا کی ہوئی ہے لہٰذا ہر انسان بلکہ ہر جاندار کو حق ہے کہ ان سے پورا پورا اور حسب ضرورت فائدہ حاصل کرے۔ پانی اور ہوا، زمین و آسمان اور جتنی فطری پیداوار ہے وہ یکساں سب کے فائدے کے لئے ہے۔ جو اس اصول کو توڑتا ہے وہ "عدو اللہ" ہے۔

غرضکہ خدا کی خالقیت کا تصور انسان کی جسمانی غلامی کو توڑنے والا ہے۔ اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی بنیادی ضمانت ہے۔ دوسرے لفظوں میں بھوک اور خوف سے نجات حاصل کر کے فراغت و مسرت کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک ایسے رب (آقا) کی غلامی کا اقرار ضروری ہے، جو دوسرے آقاؤں کی طرح ظالم و خود غرض

نہیں ہے۔ وہ آقا وہی ہے جس نے پیدا کیا ہے۔ تیسری آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(ب) دوسری آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اُس رب نے انسان جیسی ہستی کو

جو ماحصل مخلوقات ہے علق سے بنایا۔

علق: اسی لفظ سے تعلق یعنی انس یا لگاؤ بھی ہے۔ یعنی جس طرح لفظ انسان میں اُنس یا محبت کا مادہ ہے اسی طرح اس علق یعنی خون کی پھٹکی کی پیدائش بھی اُنس و محبت کی دلیل ہے۔ لغت میں علوقہ جونک کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ ننھا سا کیڑا جو بڑھ کر انسان کا بچّہ بن جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کی ابتدا ایک نہایت ناچیز خون کی بوند سے ہے، اسے اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی ہستی ہے جس نے ایک معمولی قطرہ کو انسان بنا دیا۔ (انسان بمعنی آدمؑ یعنی ھوالذی خلقکم من تراب)

اس سورہ کے بعد کئی جگہ عَلَقَہ کا لفظ قرآن میں آیا ہے، اور ہر جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وہی رب پرستش کے لائق ہے جس نے ایک ناچیز مشت خاک کو انسان بنا دیا۔ مثلاً

سُورۃ القیٰمہ۔ رکوع ۲ :۔

الم یك نطفۃ من منی یمنیٰ ثم کان علقۃ۔ فخلق فسوی الیس ذلك بقادر علے ان یحیی الموتیٰ ۝	کیا انسان منی کی ایک بوند نہ تھا جس کے بعد وہ جما ہوا خون بنایا گیا پھر اسے بنایا اور درست کیا۔ کیا وہ خدا جس نے پیدا کیا تھا اس پر قادر

نہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد اُسے پھر زندہ کر دے۔

سُورۃ المؤمن۔ رکوع ۷ :۔ پہلے قرآن نے رسول اللہؐ کی زبان سے کہا ہے کہ "مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو پوجوں اس لئے

کہ "مجھے خدا کی طرف سے اس کا پکا ثبوت فراہم ہو چکا ہے، کہ وہی ہے جو انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے" خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو پوجنا سراسر حماقت ہے:

پھر فرمایا: ۔ھو الذی خلقکم من تراب، ثم من نطفۃٍ، ثم من علقۃٍ، ثم یخرجکم طفلا، ثم لتبلغوا اشدکم، ثم لتکونوا شیوخا...... ھو الذی یحیی و یمیت

اللہ نے تمھیں (۱) مٹی سے بنایا (۲) مٹی سے نطفہ (۳) نطفہ سے جما ہوا خون (۴) پھر بچہ بنا کر نکالا (۵) پھر مضبوط جوان کیا (۶) پھر بوڑھا...... یعنی وہی خدا ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

سورۃ المؤمنون۔ رکوع ۱۔

سورۃ المومنون کا پہلا رکوع بھی علقۃ کی ناچیز ابتدا سے شروع کر کے خدا کی خالقیت کو دل نشین کرنے کے بعد اسی حقیقت کی طرف لے جاتا ہے، کہ وہی پیدا کرتا اور وہی مارتا ہے اور مرنے کے بعد پھر پیدا کرے گا۔ لہذا اس کے سوا کسی کی پرستش مناسب نہیں:۔

لقد خلقنا الانسان من سللۃٍ من طین
ثم جعلناہ نطفۃً فی قرار مکین
ثم خلقنا النطفۃ علقۃً ہ
فخلقنا العلقۃ المضغۃ ہ
فخلقنا المضغۃ عظاما ہ
فکسونا العظام لحما ہ
ثم انشأناہ خلقا اٰخر ہ
فتبارک اللہ احسن الخالقین
ثم انکم بعد ذلک لمیتون ہ
ثم انکم یوم القیمۃ تبعثون ہ

ہم نے انسان (آدم) کو کیچڑ سے پیدا کیا
پھر ایک معین جگہ میں اس کے نطفے کو ڈالا۔
پھر نطفہ کو جونک کی شکل کا کیڑا بنا دیا۔
اور اس جونک کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔
اور گوشت میں ہڈی پیدا کر دی۔
پھر ہڈیوں پر گوشت بڑھایا۔
اور پھر نئی شکل میں اسے پیدا کر دیا۔
لہذا بڑائی ہو اس پیدا کرنے والے کی جو نہایت اچھا خالق ہے۔
اس پیدائش کے بعد تم مر جاؤ گے۔
اور قیامت کے دن دوبارہ پیدا کئے جاؤ گے۔

نوٹ - عَلَقَہ بمعنی جونک یعنی چمٹ جانے والی چیز، اور علاقہ یا تعلق بمعنی لٹکانا، باندھنا، چپکنا، اُنس، سچی محبّت، جہیز، زندگی اور تجارت کے ہیں۔ ان سب سے محبت یا لگاؤ کا مفہوم ظاہر ہے۔ اسی لئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اُنس و محبت سے پیدا کیا۔

ایک سائنٹفک تحقیق یہ بھی ہے کہ انسانی نطفہ کی ابتدائی شکل ایک کیڑے کی سی بنتی ہے جو جونک کی شکل سے بڑھتے بڑھتے، سانپ مینڈک اور پھر بندر کی شکل اختیار کرتا ہے اور کئی درجے طے کرنے کے بعد انسانی شکل ظاہر ہوتی ہے۔ اس ابتدائی کیڑے کی شکل علقہ (جونک) کی سی ہوتی ہے۔

(ج) تیسری آیت۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ: اے محمدؐ تو وعظ و نصیحت شروع کر دے اور یہ بیان کر کہ تیرا رب نہایت ہی کرم کرنے والا رب ہے۔

اَکْرَمُ: اب تک آقاؤں اور دیوتاؤں کا تصور یہ تھا کہ وہ ظالم ہوتے تھے اور واقعہ بھی یہ تھا کہ غلاموں کے آقا ان سے سخت سے سخت محنتیں لیتے تھے۔ اور نہ صرف ان کے جسم کو غلام بنائے ہوئے تھے بلکہ ان کے دماغ بھی غلام کر دیئے گئے تھے۔ وہ علم سے محروم رکھے جاتے تھے۔ اور اس محرومی کی وجہ سے مختلف ملکوں میں ایسی ذاتیں بن گئی تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ غلام ہی رہتے تھے اور اپنے آقاؤں کے علاوہ پروہتوں اور پجاریوں کے بھی غلام ہوتے تھے۔ غرضکہ دنیا میں دوہری غلامی رائج تھی۔

اسلام سے پہلے عبادت کے جتنے طریقے رائج تھے ان کی بنیادیں ۲ چیزوں پر تھیں۔ اول یہ کہ جن دیوتاؤں کی پرستش کرائی جاتی تھی، وہ دنیاوی ربوں (آقاؤں) کی طرح اپنے عباد یا بندوں کی نظر میں نہایت خوفناک ہوتے تھے۔ جس طرح دنیاوی رب اُن کی محنت پر زندہ رہتا تھا

اور اپنے غلاموں کو کم سے کم آرام پہنچاتا تھا، اُسی طرح یہ اَن دیکھے دیوتا اور شیاطین اپنے شفیعوں (یعنی پجاریوں) کے ذریعے سے اپنے بندوں کی کمائی کا بہترین حصہ وصول کر لیا کرتے تھے۔ اور چونکہ آقاؤں یا بادشاہوں کے خوش کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کو نذرانے پیش کئے جائیں، اس لئے دیوتاؤں کو خوش رکھنے اور اپنی مرادیں پوری کرانے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ انھیں نذرانے اور خاص کر جانوروں کا خون اور گوشت پیش کیا جائے یہ چیز اُس زمانے کی یادگار ہے جبکہ انسان نے صحرا نوردی چھوڑ کر زراعتی زندگی میں قدم ہی رکھا تھا۔ اور یہ چیز اتنی عام ہوگئی تھی کہ لوگ اپنی اولاد کو بھی دیوتا کی خوشی پر قربان کر دیا کرتے تھے۔ غرضکہ مختلف قوموں کے دیوتا خونخوار، اور اُن کے بندے پجاریوں کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے اور عقل سے محروم تھے۔

عبادت کا دوسرا طریقہ تھا کہ یہ تصور عام کر دیا گیا تھا، کہ اگر ایک دیوتا انسان کو خوش نہ کر سکے اور باوجود قربانیوں کے اس کی مراد پوری نہ ہو سکے، تو وہ دوسرے دیوتا سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور جس طرح دنیا میں مختلف قسم کے راجہ یا فوجی سردار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور ایک دوسرے سے برسرِ جنگ رہتے ہیں اسی طرح دیوتاؤں میں بھی کش مکش جاری ہے۔ ہر قوم کے ایک نہیں، بلکہ گھر گھر دیوتا تھے پھر آسمان کے دیوتا الگ، زمین کے الگ، عورتوں کے الگ، جانوروں کے الگ، دولت کے الگ، جنگ کے الگ تھے۔ جسے خوش کرنا ہو اس کے پجاری کے ذریعے سے اس کو خوش کرو اور قربانی پیش کرو۔ ان دیوتاؤں کی بیبیاں بھی ہوتی تھیں، اور بچے بھی ہوتے تھے۔ غرضکہ ہر طرح سے پروہتوں کی اجارہ داری تھی، اور یہ پیشہ اتنا مفید تھا کہ اس کے راز سوائے مخصوص لوگوں کے اور کسی پر ظاہر کرنا جرم بنا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ پجاریوں کی ذاتیں

بن گئی تھیں اور صرف اُن کی اولاد ہی کو یہ حق تھا کہ وہ دیوتاؤں کے خوش کرنے کے راز اور اُن کے منتروں سے واقف ہوں۔ ایران میں موبد دستور ہند میں برہمن، اور عرب میں سدنہ قریش کی اجارہ داری مذہب و عقل پر چھائی ہوئی تھی۔ مصر میں بھی یہی حال تھا اور قدیم سوسائٹی میں تو قدرت کا ہر قانون جو کسی کو معلوم ہو جاتا تھا وہ اسے اپنے نفع کے لیے حتی الامکان راز ہی میں رکھتا تھا۔ غرضکہ پوجاریوں، ساحروں اور ساحر طبیبوں کی خود غرضی اور حرص نے لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ یہ بھی بنالیا تھا کہ اگر ایک قسم کے دیوتا سے کام نہیں چلتا تو سینکڑوں دوسرے قسم کے اور دوسری صفات کے دیوتا، ان کی مائیں اور بیویاں موجود تھیں، جو لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے تھیں۔ دیوتاؤں یا معبودوں کی کثرت کی ذمہ داری عوام پر نہ تھی، اس کی ذمہ داری پوجا کرانے والی جماعت پر تھی جو لوگوں کو اندھا بنائے ہوئی تھی۔ اور اکثر پوجا یا سحر کے کسی راز کا اتفاقیہ انکشاف، غیر پجاری کے لئے قتل کا پیغام ہوتا تھا۔

اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ خدا کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اکرم ہے کیا کیا معانی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ خدا خونخوار خدا نہیں ہے، جو قربانی کے خون اور گوشت سے خوش ہوتا ہو، دوسرے یہ کہ جب وہ سب سے زیادہ کریم ہے تو متعدّد اور مختلف دیوتاؤں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مذہبی اجارہ داروں یعنی پجاریوں اور سادنوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہر شخص اپنے اکرم خدا سے براہ راست جو چاہے مانگ سکتا ہے۔ شفیع یا پجاری کی ضرورت نہیں ہے۔

اس پہلی وحی میں خدا کی کریمی پر جو زور دیا گیا ہے وہ اسی لئے کہ لوگ دوسرے دیوتاؤں کی طرح اُسے بھی خونخوار نہ سمجھیں بلکہ رحم و کرم کا سرچشمہ جانیں۔ اس سے پہلی آیت میں "علق" یا "محبّت" و "اُنس" کا

ذکر بھی اسی غرض سے کیا گیا ہے کہ انسان اپنی ایک نئی روحانی دُنیا بنائے جس میں ظلم و خوف کی جگہ رحم و محبّت قائم ہو۔ یہاں یہ نوٹ کر لینا چاہیئے کہ آنحضرتؐ سے پہلے دو انسان اور گزر چکے ہیں جنھوں نے قربانی اور مذہبی ذات کو مٹانے کی کوشش کی تھی یعنی گوتم بدھ اور عیسٰیؑ بن مریم۔ دونوں نے رحم و محبّت کا پیغام اپنے اپنے زمانے کے پجاریوں اور ربیوں کی قربانیوں کے خلاف دیا تھا، لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ان دونوں مذاہب کی بنیادی تعلیم مسخ ہو گئی اور ان پر عمل ناممکن کر دیا گیا۔ قربانی پھر رائج ہو گئی۔ اور ذاتیں پھر بن گئیں۔ مسیحؑ سے چھ سو برس پہلے جو پیغام بدھ نے دیا اس کو عملی جامہ محمدؐ عربی نے کس طریقے سے پہنایا، یہ چیز ہم قرآن و سیرت سے ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ بہرحال پہلی وحی اس بات پر زور دیتی ہے کہ خدا اکرم ہے، اور دوسروں کے پاس دست طلب پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ نہ قربانی کی ضرورت ہے نہ پجاری کی۔

(د) چوتھی آیت۔ **اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمْ:** اس خدا کا یہ کتنا بڑا اکرم ہے کہ وہ علم قلم کے ذریعے سے دیتا ہے۔ یعنی وہی علیم ہے۔ نہ یہ پجاری علم رکھتے ہیں نہ اُن کے دیوتا اور شیطان۔

سچا علم اور وہمی عقیدہ: موجودہ زمانے میں علم کی آزادی کی وجہ سے جو ترقی ہوئی ہے اس سے علمی اصطلاحات زیادہ واضح اور روشن ہو گئی ہیں۔ امام ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے زمانے میں ابن عربی کے فلسفہ کی مدد سے اصطلاحات کو نہایت صاف اور آسان بنا دیا تھا۔ ضرورت ہے کہ اب ہم ان قدیم اصطلاحات کو نئے علوم کی روشنی میں دوبارہ سمجھیں اور ان کی موجودہ شکلوں کو پہچانیں۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں علم کی صحیح تقسیم یہی ہو سکتی ہے جو قرآن کی

پہلی وحی نے بتائی ہے۔ یعنی وہ عقائد جو توہمات اور مفروضات سے پیدا ہوں وہ شیطانی ہیں اور حقیقی علم سے بہت دور ہیں۔ حقیقی علم یا سچا علم قلم یعنی عقل و تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عقل و تجربے کی قوت خدا دیتا ہے اور وہی سچا علم ہے۔ بالفاظ دیگر وہ علوم جنہیں ہم آج کل سائنس کہتے ہیں وہ خدائی تعلیم ہے۔ سائنس مادیات ہی کا مشاہدہ نہیں کرتی بلکہ سوچنے اور سمجھنے کے اصولوں (منطق) انسانی عمل و کردار، علم الاخلاق کے قاعدوں نفس و شعوری زندگی (علم النفس)، اور ماورائے مادہ تصورات (مابعد الطبیعیات) کی حقیقت پر بھی غور کرتی ہے اور تجربے، مشاہدے اور مقابلے کے بعد چند اصول بناتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جو لوگ بلا سوچے سمجھے یا غلط طریقے پر سوچ سمجھ کر بعض اصول بنا لیتے ہیں، یا دوسروں سے سُن سُنا کر بغیر کسی بات کو پرکھے ہوئے یہ مان لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے، وہ غلط راستے یا غلط عقیدے پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اسی کو توہم پرستی اور غلط اندیشی کہا جاتا ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں اس طرح کا علم شیطانی علم ہے جو قلم یعنی عقل و تجربے سے حاصل نہیں ہوا۔ من اتخذ الٰھہ ھواہ اور وسواس الخناس ہی کا نام شیطان پرستی اور جہل بمقابلہ علم یا کتاب یا وحی کے ہے۔

(نوٹ۔ فلسفہ سانکھیا (ہند) (جس پر بدھ مت کی بنیاد ہے) کے مطابق علم ہی نیکی ہے، اور چونکہ مادی کائنات میں حرکت ہے، شعور و آگہی نہیں ہے بخلاف اس کے روح میں شعور ہے حرکت نہیں ہے۔ اس لئے روح اور مادہ دونوں ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں۔ اور علم کے ذریعے سے روح مادہ کی حاکم بن جاتی ہے اور آخرکار نیکی کے علم سے وہ نجات حاصل کر لیتی ہے)

ذریعۂ علم قلم ہے: قلم وہ آلہ ہے جس کے ذریعے سے انسان اُس علم کو جو خدا دیتا ہے، قلم بند کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا براہ راست کسی کو

اگر تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ اس کو ایسی عقلِ سلیم، اور قوتِ مشاہدہ عطا فرماتا ہے جس سے وہ اپنے تجربوں سے فائدہ حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور پھر ان کو لکھ کر دوسروں تک پہنچانے کا سامان بھی کر سکتا ہے۔

یہاں دو باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ خدا خالقِ انسان ہے اُسی نے آدم کے حواس اور عقل کی قوت کو بھی خلق کیا ہے۔ اور اس لئے کیا ہے کہ وہ ان کے ذریعے سے علم حاصل کر سکے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ خدائی علم اور شیطانی علم کا فرق بتایا گیا ہے۔ خدائی علم وہ ہے جو قلم کے ذریعے سے ہر انسان تک پہنچ سکے، خواہ وہ مکانی فاصلے پر ہو یا زمانی فاصلے پر، بخلاف اس کے شیطانی علم (اگر اسے علم کہا جا سکے) وہ علم ہے جو محض ایک جماعت تک محدود ہوتا ہے۔ نہ قلم کے علم کی طرح اس کے کلمات اور معانی واضح (ع۔ب) ہوتے ہیں۔ نہ وہ عام فائدے کے لئے ہوتا ہے نہ وہ علم تجربہ اور مشاہدہ کے حقائق کو بیان کرتا ہے، بلکہ وہ علم یا تو ستاروں کو دیکھ کر، یا پانسے پھینک کر، یا جنوں اور شیطانوں کے نام پر حاصل کیا جاتا ہے، اور تنقید کی کسوٹی پر بر سرِ عام، قلم کے ذریعے سے نہیں لایا جاتا، اس لئے کہ نہ تو اُس کہانت و سحر کے الفاظ کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور نہ وہ اس لئے ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ اس کو جانیں اور خود استعمال کر سکیں۔ وہ ابتدا ہی سے بے معنی اور مہمل لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے تاکہ جاہل اور خائف انسان ان ساحروں اور کاہنوں کے جال میں پھنسا رہے اور اپنی ہر عزیز چیز ان کے حرص و آز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا رہے۔

علم اور اختیار:۔ آئندہ چل کر قرآن میں اکثر جگہ "کتاب" اور "اہل کتاب" کا ذکر آیا ہے۔ کتاب کے معنی بھی علم کے ہیں "اہل کتاب" اہل علم اور متمدن و مہذب عقلمند لوگوں کو کہا گیا ہے۔

اس کے مقابلہ میں اُمی کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ لوگ جو تمدن، قانون وعلم سے بہرہ ور نہیں ہوئے، یا اپنی فطری حالت میں بغیر کسی قانون حیات (کتاب) کے زندگی بسر کرتے ہیں۔

البتہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں، جو عالم ہونے کے مدعی ہیں، لیکن اپنے شیطانی علم (سحر، شعر، کہانت) کو رازمیں رکھتے ہیں۔ اور سچے علم کتاب کی طرح علانیہ (لسان عربی مبین میں) دوسروں کو نہیں پہنچاتے۔ یہ لوگ درحقیقت شیطانی ایجنٹ ہیں اور ان کا علم محض فریب اور روٹی کمانے کا ذریعہ ہے اسی لئے قرآن نے آئندہ بار بار کہا ہے کہ قرآنی تعلیم کے لئے کسی اجرت یا معاوضہ کی خواہش رسول عربی کو نہیں (ان اجری علی اللّٰہ)

گویا قلم کے معنی نہ صرف علم کے ہیں بلکہ اچھے علم کے ہیں۔ ایسا علم جو اہل عقل (اولی الالباب) خدا کی دی ہوئی عقل سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر انھیں اس بات کی بھی آزادی ہے کہ اپنی عقل سے حاصل کئے ہوئے علم پر عمل کریں یا نہ کریں یہ رب کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ اس نے انسان کو مشعل علم و عقل عطا کی اور اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ اندھوں کی طرح چلیں یا جانوروں کی طرح صرف اپنے انسٹنکٹ کی پیروی کریں۔ انھیں عقل دینے کے باوجود بااختیار بنایا۔ چاہیں تو وہ سیدھی راہ پر چل کر منزل تک پہنچیں، اور چاہیں تو ٹیڑھی راہ اختیار کر کے گڑھے میں گر جائیں۔

آئندہ چل کر جب یوم الدین یعنی جزا و سزا کے دن کا تذکرہ کیا ہے تو اس وقت بھی یہ آیتیں پیش نظر تھیں کہ خدا اکرم ہے۔ لہذا یہ کہہ دیا گیا، کہ اللہ عادل تو ہے ہی، وہ انصاف کے دن یعنی قیامت میں لوگوں کے اعمال کے مطابق انھیں جزا و سزا دے گا۔ لیکن ان فیصلوں میں بھی اس کا رحم و کرم شامل رہے گا۔ اور وہ جس کمزوری یا گناہ کو چاہے گا معاف کر دے گا۔ البتہ ایک گناہ جس کے لئے کم عقلی یا کم علمی یا مجبوری کی معذرت قبول نہ ہوگی

وہ شرک ہے۔ قرآن کے سامنے خدا کا واحد اور یکتا ہونا اتنا بدیہی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی عالمگیر قدرت میں دوسری طاقت کو شریک بنائے جس نے کائنات کو خلق کیا ہے، تو یہ ناقابل معافی جرم ہے۔

(۵) پانچویں آیت۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: اس مہربان خدا نے یہ کتنی بڑی مہربانی کی ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہر انسان کے لئے علم کا راستہ کھول رکھا ہے۔ جن باتوں کا علم انسان کو نہیں ہوتا وہ خدا ہی دیتا ہے۔ یعنی قدرت کے راز جو انسان کی نظر سے پوشیدہ ہیں وہ خدا ہی حسب موقع وزمانہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ساحر و کاہن سچ کہتے ہیں کہ جن و شیطان انھیں علم دیتے ہیں، تو بھی وہ علم خدائی علم کا مقابل و مماثل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لئے شیطانی علم تو صرف پجاریوں اور ساحروں تک محدود ہے، خدائی علم ہر انسان کے لئے جو اس کا بندہ ہے، عام ہے۔ اور جو علوم الٰہیہ کو راز میں رکھے وہ بندہ شیطان ہے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں کا ایک ہی قافیہ ہے اور یہ تینوں ایک ہی مضمون یعنی علم، ذریعۂ علم، اور مہبط علم سے بحث کرتی ہیں ماحصل ان کا یہ ہے، کہ جس طرح خدا ہی خالق ہے اسی طرح صرف وہی علیم ہے۔ اور باوجودیکہ وہی رب یا آقا ہے، وہ نہ تو علم کو کسی ذات تک محدود رکھتا ہے، نہ اپنی مخلوق انسانیت میں کسی کو آقا اور غلام قرار دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی نعمت یعنی علم سب کے لئے مساوی طور پر عام ہے۔ اور یہی اس کا سب سے بڑا کرم ہے کہ انسان جسمانی اور دماغی طور پر پورا پورا آزاد ہو، قدرت کے عطیوں سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھائے، اور جو لوگ اس راہ میں

ارباب من دون اللہ بن کر حائل ہوں، ان کے خلاف اعلان بغاوت کر دے۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا، فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون ٥

عَلَّمَ آدَمَ اَسْمَاءَ کُلَّھَا۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ

آدم یعنی انسان کو جو کچھ سچا علم ملتا ہے وہ خدا ہی دیتا ہے شیطان کی رسائی حقیقی علم تک نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ خدائی علم اور خدا کا علم دونوں اولاد آدم کو غیر اللہ سے بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں۔ رسول عربی صلعم نے گونگوں کو زبان عطا کی۔ مجبور غلاموں کو بغاوت کی تلوار دی اور انسانیت کو حقیقی آزادی کا مطلب اس طرح سمجھایا کہ اللہ کا نام لے کر کل شیطانی نظاموں کو توڑ دیں۔

بہر حال قرآن کی یہ بنیادی تعلیم ہے کہ یہ جو غیب کے علم کے دعویدار کاہن وساحر بنے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنوں، شیطانوں، ستاروں یا فال وغیرہ کے ذریعے سے وہ چھپی ہوئی باتوں کا علم حاصل کرتے ہیں یہ سراسر غلط دعویٰ ہے۔ وہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مقصد ان کا یہ ہے کہ انسانی عقل وشعور کو اپنا غلام بنائے رکھیں اور ان ذہنی غلاموں کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالیں۔ اس قسم کی جماعتیں انسانیت کی دشمن ہیں، ان کو مٹا کر ہی عقل انسانی آزادی کی صراط مستقیم پر چل سکتی ہے۔

پہلی وحی کے اجمال کی تفصیل

یہ وحی گویا وہ پیغام ہے جو آنحضرت صلعم کے تحنث کے نتیجے میں خدا نے آپؐ کے دل پر نازل کیا یہی پیغام اسلام کا بنیادی پیغام بنا۔ بعد کا قرآن صرف اس مختصر مگر جامع پیغام کی تفصیل ہے۔

۱۔ خدا خالق ہے: باقی کائنات مخلوق ہے، اسی خالق نے انسان کو پیدا کیا ہے، جو ما حصل کائنات ہے۔ (یعنی روح اور مادہ الگ الگ ہیں اور خالق و مخلوق بھی ایک نہیں ہے۔ لیکن اُنس یا محبت روح و مادہ میں ایک کڑی ہے)

۲۔ علم کا ذریعہ عقل ہے: عقل خدا نے بخشی ہے۔ عقل (یعنی قلم) کے ذریعے سے انسان کی ہدایت خدا ہی کرتا ہے۔ کوئی دوسری طاقت نہ علیم ہے نہ علم دے سکتی ہے۔ خدا ہی عقل و حواس کے ذریعے سے انسان کو علم دیتا ہے۔ کوئی اور طاقت (مثلاً شیطان وغیرہ) نہ علم رکھتی ہے نہ دے سکتی ہے۔ عقل کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے نہ چلنے کی آزادی بھی خدا نے دے دی ہے۔

نتیجہ: جسمانی و ذہنی آزادی و مساوات: (۱) جب سب انسانوں کا خالق خدا ہے، تو سب انسان بندہ ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ غلام و آقا فقیر و امیر وغیرہ کے امتیازات انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ خدا کی طرف سے سب کو جسمانی و ذہنی آزادی دی گئی ہے۔

(۲) خدا نے سب انسانوں کو عقلی صلاحیتیں دی ہیں، ان کو ایک چالاک گروہ نے اپنے فائدے کے لئے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اس سے

آزاد ہونے کے لئے انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ علم تو خدا دیتا ہے، نہ کہ ان کاہنوں اور ساحروں کے شیاطین۔ اس لئے ہر انسان کو فکر و تدبر کی آزادی ہے، وہ براہ راست، بغیر کسی شفیع یا درمیانی کڑی کے اپنے عقل و تدبر کے استعمال کا حق رکھتا ہے، اور خدا سے، یعنی منبع خیر سے علم حاصل کرسکتا ہے۔ کاہنوں یا پجاریوں یا پوپوں، دستوروں برہمنوں کی ضرورت نہیں کہ علم کی اجارہ داری ان کی ہو اور لوگ اپنی عقلی کاوش اور فکر سے ہی نہیں، بلکہ خود "علم" سے محروم کردیئے جائیں۔

کیوں؟

تاریخ شاہد ہے کہ عقل انسانی کی جب کوئی جماعت ٹھیکہ دار بن جاتی ہے، اور دنیا میں شیطانی آمریت کی بنیاد ڈال کر جمہور کو ان کی تخلیقی قوتوں کے استعمال سے روک دیتی ہے تو وہ قوم فنا ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پوری ملکی زندگی میں رسول عربی صلعم کی لڑائی اس جماعت سے رہی جو سدنہ "قریش" (یعنی مکہ کے پجاری) کے نام سے مشہور تھی۔ اور خانہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں نہ صرف پوجا پاٹ اور عبادت کرنے کے اعمال کو جانتی تھی، بلکہ اُن چیزوں کی واحد اجارہ دار بھی وہی جماعت تھی۔ عبادت اصنام اور ارکان حج اور حج کی تاریخوں کا تعیّن، حج کے مہینوں کا حرام یا حلال کرنا، جنگ و صلح کے قاعدے مقرر کرنا، لٹریچر کے ڈھنگ اور اس کی حدوں کو متعین کرنا، پیشین گوئی کرنا، اور سفر کے لئے سعد و نحس گھڑیاں مقرر کرنا سب ایک مخصوص جماعت کے قبضہ میں تھا۔

جب رسول عربیؐ نے ان دو باتوں کا اعلان کیا کہ خدا خالق ہے، اور علیم ہے، تو گویا اس جماعت سے اعلانِ جنگ کردیا جو کہتی تھی کہ کوئی خالق نہیں ہے، یا اگر ہے تو خدا کے ساتھ اور اس کا ہمسر شیطان بھی ہے اور وہ اور اس کے جن علیم ہیں اور انسان کو ہمارے (یعنی پجاریوں کے) ذریعے سے علم دیتے ہیں۔ یعنی یہ آسان بات نہیں کہ ہر شخص علم حاصل کرسکے

اور شیطانی رازوں کو جان سکے جب تک کہ شیطان کی پرستش نہ کرے۔ بعض کا خیال تھا کہ (مثلاً نصاریٰ و مجوس) خدا کی حکومت آسمان پر ہے اور اس دنیا میں شیطان کی حکومت ہے۔

جو لوگ خدا کے منکر تھے، وہ روح کے بھی منکر تھے، اور مرنے کے بعد روح کی بقا کے خیال کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اور وہ جو "دو خداؤں" یعنی شیطان و یزداں کے قائل تھے انھیں بھی بعث بعد الموت کی پرواہ نہ تھی اور وہ بھی یزداں کو ملک یوم الدین نہیں مانتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ ہماری دیویاں اور شیاطین خدا کے رشتہ دار ہیں۔ وہ یزداں سے سفارش کر کے ہماری بداعمالیوں کو معاف کرا سکتی ہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے بھی بعث بعد الموت کا کوئی واضح خیال نہ تھا۔ خود یہودیت میں بعث بعد الموت کا تصوّر توریت میں نہیں ہے۔ اس لئے جب قرآن نے یہ کہا کہ خدا خالقِ کل ہے، تو اس سے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ کر سکتا ہے۔ اور ظالموں کو سزا، اور صالحوں کو جزا دے سکتا ہے۔

خدا خالق ہے نہ علیم

کفار مکہ نے ان دونوں باتوں سے صاف انکار کر دیا اس لئے کہ (۱) خدا کو خالق ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے ایک ایسی طاقت کو مانے جو مردہ کو زندہ کر سکتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی نیک و بد اعمال کی جزا و سزا دے سکتی ہے۔ لہٰذا قرآن کے آئندہ بیانات سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے سرے سے خدا ہی کا انکار کر دیا، اور جنھوں نے انکار نہیں کیا وہ خدا کا ہمسر شیطان کو ماننے لگے۔

(۲) خدا کو علیم ماننے میں ان کا ذریعہ معاش ختم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ انھوں نے ایک پجاریوں اور کاہنوں کی جماعت بنا رکھی تھی جو شیطانوں اور جنوں کے ذریعے سے علم و سحر و شعر حاصل کرنے کی دعوے دار تھی اور

پیشین گوئی وغیرہ کے ذریعے سے دولت کمائی تھی۔ اگر ایسا خدا ہے جو سب کو یکساں علم دے سکتا ہے تو پھر پجاری عالموں کی اور اسرار غیب جاننے والے کاہنوں کی یا پوجا اور قربانی کے طریقے جاننے والے برہمنوں کی یا کسی نہ کسی خفیہ ترکیب (یا سحر) سے غیبی قوتوں کو خوش کرنے والی جماعتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ علم، یا علم غیب جس سے بندہ بھی خوش رہے، اور خدا بھی اپنی نعمتیں نازل کرے سب کے لئے ایک سربمہر راز نہیں رہتا۔ بلکہ خدا کی بنائی ہوئی ہوا اور بارش کی طرح عام ہو جاتا ہے۔

حروف مقطعات اور ترتیب نزول قرآن :

قرآن کی بہت سی سورتیں حروف ابجد (یعنی حروف مقطعات) سے شروع ہوتی ہیں۔ پہلی وحی بھی علم اور قلم کی تعریف سے شروع ہوئی ہے۔ اسی طرح اکثر سورتوں میں اس طرف اشارہ ہے کہ علم یا وہ حروف تہجی جن سے کلمات بنتے ہیں، اور جن سے سمجھ میں آنے والی زبان (لسان عربی مبین) بنتی ہے، یہ ہی خدا کی ہستی کی دلیلیں ہیں۔ یعنی خدا کا وجود اور اس کے علم کا طریقہ یہی ہے کہ انسان قدیم کتب سے علم حاصل کرے۔ تعلیم سے عقل پر جلا ہوگی۔ اور عقل سے اس پر روشن ہو جائے کہ علم ہی ذریعۂ نجات ہے اور حروف تہجی ہی ذریعۂ علم ہیں۔ نہ کہ ساحروں کے مہمل زمزمے اور کاہنوں کی بے معنی سجع۔

سورۃ العلق کے عام ترجمے کا اصلی مفہوم سے مقابلہ

ارباب من دون اللہ کے خلاف اعلان بغاوت

عام ترجمہ	حقیقی مفہوم
سورہ ع۹٦ سورۃ اقرأ	وحی اول سورۃ العلق۔ سورۃ الفاتحہ ام القرآن کنز
۱۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے	۱۔ اے محمدؐ تو اپنے اس آقا کے نام سے نصیحت یا حمد شروع کر، جو پیدا کرنے پر قادر ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے (اس کے سوا کوئی آقا ایسا نہیں جو خلق کر سکے)
۲۔ اُس نے بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے	۲۔ اُس آقا نے ایک ناچیز قطرۂ خون سے آدم (محبت و عقل و مردانگی و اخلاق والا انسان) پیدا کر دیا۔
۳۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے	۳۔ حمد و نصیحت شروع کر دے یقیناً تیرا آقا سب کریموں سے کرم میں زیادہ ہے (کہ اس نے تجھے نطق و علم دے کر ہدایت کرنے پر مامور کیا)
۴۔ جس نے علم سکھایا قلم سے	۴۔ اپنے اُس آقا کے نام سے نصیحت و حمد شروع کر جو قلم (عقل و مشاہدہ) کے ذریعہ سے علم دیتا ہے (جو سحر کی طرح راز نہیں، بلکہ کتاب کی طرح ہر شخص کی عقل کے لئے عام ہوتا ہے)
۵۔ اُس نے آدمی کو سکھلایا جو وہ نہ جانتا تھا	۵۔ اُسی آقا نے (قلم کے ذریعے) ایسی باتیں آدم کو سکھائی ہیں جو وہ (حیوانی صورت میں) نہ جانتا تھا۔ (عقل و تمیز دے کر خدا نے انسان بنا دیا اور علم حاصل کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی صراط مستقیم کھول دی۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ اپنے نفع کے لئے غلام کی تربیت نہیں کی، بلکہ خود غلام کے فائدے کے لئے اُسے عقل و علم دیا)

اِنسان کا مقام

(رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. آل عمران ۲۰ع)

قرآن حکیم کی ابتدا انسان کی حقیقی جگہ متعین کرتی ہے۔ وحی اوّل میں جو بات کہی گئی ہے وہ اتنی بلند وسیع و عمیق ہے کہ جملہ کتب الٰہیہ اور بعد کا قرآن اسی کی تفسیر ہے۔ یہ وہ ذات ہے کہ اسے خلیفۃ اللہ فی الارض کا خطاب ملا۔ یہی وہ ہستی ہے جو دیگر جانداروں کے "فطری جبر" سے نکال کر عقل و شعور کے میدان "قدر" میں لا کھڑی کی گئی اسی کو "کلمات اللہ" کے جاننے کا شرف و شعور ملا۔ اور اسی کے لئے موت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ تاکہ جب موجودہ جسم سے اس کی روح نقل مکانی کرنے کے بعد دوبارہ "مبعوث" ہو تو اپنے اعمال کی تفصیلات خندہ پیشانی سے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے سامنے پیش کر سکے، اور اُن کے بدلے (جزا) میں نعیم و سرور کی نہ ختم ہونے والی فراغتوں اور راحتوں میں طبق عن طبق گزرتا رہے۔ قرآن حکیم کل انسانیت کے لئے یہی "پیغام حیات و سرور" لایا ہے ولا تقولوا من یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء سے یہی مراد ہے۔ بلاشبہ جو لوگ شیطان یا شر کی ولایت چھوڑ کر اللہ کے ولی ہو جاتے ہیں وہی اپنی حقیقت تک فائز ہوتے ہیں۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۰ قرآن اسی انقلاب کی تعلیم دیتا ہے اور سیرت سے اس انقلاب لانے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ ملا جامی نے سچ کہا ہے کہ:۔

ایزد کہ نگاشت خامۂ احسانش ۔۔۔ ابواب کتاب عالم و ارکانش

برلوح وجود زد رقم فہرستے ۔۔۔ در آخر کار، نام کرد انسانش

اسلام کا اصلی ماخذ قرآن ہے

مطبوعات بیت الحکمت دہلی (ہند)

ا۔ پس منظر اسلام۔ چار حصوں میں
۱۔ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت
۲۔ اسلام سے پہلے عرب کی حالت
۳۔ مختصر سیرت سیدنا محمد صلعم
۴۔ حیات محمدی قبل بعثت

۴۔ اعلان انقلاب
سورۃ العلق کا مفہوم
یعنی
فلسفۂ وجود اور فلسفۂ علم کی بحث کے
بعد اسلام کی بنیادی تعلیم کا خلاصہ۔

۲۔ ترتیب نزول قرآن کریم
احادیث کی مدد اور خود قرآن کے داخلی مطالعہ کے بعد قرآن کی مختلف سورتوں اور رکوعوں اور پھر آیتوں کی ترتیب تنزیلی بتائی گئی ہے اسکے علاوہ اس پہلے کی تحقیقاتیں بھی درج کردی گئی ہیں

ان نوجوان طلبہ کے نام

جو

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال کا تاریخی ترتیب قرآن اور تاریخ تمدن انسانی کی روشنی میں مطالعہ کر کے اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں

اور

یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ فکر و عمل اسلام کی تعبیر میں کیوں علمائے اسلام متفق الرائے نہیں

اراکین بیت الحکمت، دہلی (ہند)

۵۔ پیمان انقلاب
مفہوم سورۃ الحمد
جس میں
ہندوستان کے چھ بیس اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ترتیب تنزیلی کے بغیر قرآن کریم کا مطالعہ آسان نہیں ہے۔

۳۔ مشکلات قرآن کا انقلابی حل
تفسیر بالرائے نے جو مشکلات فہم قرآن میں پیدا کردی ہیں، ان کا انقلابی حل، ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں۔

سول ایجنٹ
سنگم کتاب گھر
اردو بازار
دہلی

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ترتیب نزول قرآن کے مطابق فکر محمدی اور قرآن کے ساتھ ساتھ عمل نبوی کو پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے نمایاں کیا گیا ہے۔

سیرتِ قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(لقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدّکر؟)

بادشاہی اور جاگیرداری دور ختم ہو رہا تھا۔ جمہوری اور مشینی دور کی ابتدا تھی اس وقت امام ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کی انقلابی روح کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ارباب حکومت اور امرا کے لئے تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی حکمت عقل، نقل اور کشف کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے تفسیر فتح الرحمان سے پہلے اسے اور المسوّی کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ متوسط طبقہ کے لئے شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۱۵۹ - ۱۲۳۹) نے تفسیر فتح الرحمان کے اصولوں کی تشریح کے لئے فتح العزیز لکھی اور جماعت مجاہدین تیار کی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو قرآن و حدیث کا درس دیا اور انھوں نے قرآن کو امت مسلمہ کے عام لوگوں کی ہندوی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ قرآنی دعوتِ انقلاب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی تھے۔

قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سیرت نبوی کے سلسلے میں اس کے تاریخی ادوار متعین کرلئے جائیں اور تاریخ تمدن انسانی کے پس منظر میں اسے اپنی اپنی زبان میں سمجھا جائے۔ اردو میں اس قسم کی مختصر سیرت مکتبہ بیت الحکمت دہلی سے مل سکتی ہے۔ اسے "بیت الحکمت ہند" نے بیس زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس سیرت میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمونہ "بیان انقلاب" ہے۔ اس طرح سیرت کے قرآنی مطالعہ سے متعدد غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور حکمت قرآنیہ فکر انسانی سے بہت قریب آجاتی ہے۔

قیمت قسم اول چار روپے، قسم دوم تین روپے

سول ایجنٹ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی

مطبوعات بیت الحکمت۔ دہلی (ہند) (۳)

پیمان انقلاب

پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں سورۃ الحمد کا انقلابی مفہوم

محمد اجمل خاں

فہرست مضامین پیمان انقلاب

هٰذا بصائر للناس وهدى ورحمة لقوم يوقنون ○

یہ تعلیم انسانوں کے دلوں کو عقل سے معمور کرتی ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے رہنما و رحمت ہے

هٰذا بيان للناس وهدى وموعظة للمتقين ○

پیمانِ انقلاب

یعنی

پس منظر اسلام اور نظم و ترتیب قرآن کی روشنی میں

سورۃ الحمد

کا

قرآنی مفہوم

از

محمد اجمل خاں

سول ایجنٹ در ہند

سنگم کتاب گھر اردو بازار، دہلی

پہلا اردو ایڈیشن   سنہ ۱۹۵۲ء سنہ ۱۳۷۲ھ

جملہ حقوق طباعت و ترجمہ بحق سیف الاسلام خاں جامعی
ہند، پاکستان، برما و سیلون محفوظ ہیں

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

بیت الحکمت دہلی (ہند) کی طرف سے سیف الاسلام خاں جامعی
نے شائع کی

سول ایجنسی در ہند۔ سنگم کتاب گھر، اردو بازار، دہلی
" " در پاکستان۔ مکتبہ بیت الحکمت اردو بازار لاہور (پاکستان)

قیمت مجلد (عہ؍)   قیمت بلا جلد (عہ؍)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال

سننے والے کانوں اور سمجھنے والے دلوں کے لئے قرآن میں کتاب و حکمت (قانونِ حیات و فلسفہ زندگی) کی حسین و جمیل تعلیم اپنی بے پایاں عالمگیریت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے وحی ہونے سے مشرکوں کو کبھی انکار نہ تھا۔ اس کی اثر آفرینی اتنی زبردست تھی کہ سمجھنے والے مشرکین مکہ اسے سننا نہیں چاہتے تھے بلکہ الغاء کرنا اور شور مچانا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ یہ وحی ہے مگر شیطان کی طرف سے۔ یہ یقیناً جنوں کے ذریعہ نازل ہوئی ہے۔ ہمارے شاعر و ساحر، کاہن و عرّاف تک اس کو سن کر حیران ہیں! اس میں ایسا سحر بھرا ہوا ہے کہ ہر سننے والے پر اثر کرتا ہے۔ شاید مرزا مرحوم نے اسی لئے دعا مانگی تھی کہ خانہ کعبہ پھر بتخانہ بن جاتا تو کم از کم بت پرستانِ قریش کی مانند قرآن کی بلاغت و فصاحت پھر لوگوں کے دلوں کو گرما سکتی اور صنم خانۂ کعبہ کا سچا الیس منظر، حرم کی حقیقت کو پھر نمایاں کر سکتا ہے۔

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را ——— خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

حسن و جمال کا ہر شاہکار ظہر و بطن رکھتا

صورت و معنی یا ظاہر و باطن ہے اور ہر ناظر کی نظر میں مختلف کیفیتیں

پیدا کرتا ہے ۔ جو لوگ صورت و معنی دونوں پر دسترس رکھتے ہیں وہ بقدر ظرف اس کی جمال آفرینی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں ورنہ مولانائے روم کی زبان سے کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درونِ من نجست اسرار من
سرِ من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را دید جاں منظور نیست

تو کیا فہم قرآن کے لئے جو نہ صرف دنیا کی بہترین ترقی یافتہ زبان یعنی عربی میں ہے، بلکہ زبان وحی میں اللہ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے انسان عرب ہو اور وہ بھی ویسا عرب جو رسولِ عربی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا؟ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے غالباً اسی لئے قرآن کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی مخالفت کی تھی اور ایک شاعر نے تو یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ قرآن سمجھنے کے لئے کافر ہونا ضروری ہے ؎

کافر نشدی لذتِ ایماں چہ شناسی

پس منظر اسلام و ترتیب نزول قرآن

قرآنی تعلیم کے ظاہر و باطن، صورت و معنی کو عام فہم زبان میں پس منظر اسلام اور ترتیب و نظم قرآن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اصلی نظم قرآن وہی ہے، جس طرح اور جس ترتیب سے وہ مختلف مکی اور مدنی ادوار میں خدا کی طرف سے قلبِ رسول ﷺ پر نازل ہوا ہے، اور پھر انہوں نے اپنے الفاظ میں انسانوں کو سنایا ہے۔

پس منظر اسلام

کسی فنی شاہکار کو سمجھنے اور اس کے لطیف اثرات سے فیض حاصل کرنے کے لئے پس منظر کا ہونا ضروری ہے شعر ہو یا تصویر، نغمہ ہو یا تعمیر جب تک اسی فنی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نہ ہو اس کی مادی صورت نظر کے لئے جنت نگاہ نہیں بن سکتی۔ اسی لئے

غالب نے فرمایا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینا چاہئیے :۔

(۱) اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے ابتدائے تمدن سے ہر ملک و قوم میں ایسے مصلح پیدا ہوتے رہے ہیں جو کہتے رہے کہ اللّٰهُ ربّی وَ ربّکم فاعبدوہ هٰذا صراطٌ مستقیم۔ خدا کو آقا ماننا۔ اسی کی بندگی کرنا ہی دینِ فطرت ہے کسی دیوتا، انسان یا درخت کے آگے جھکنا شرف و علوِّ انسانیت کو غارت کرنا ہے۔ غرضکہ اسلام یعنی طاعتِ الٰہی کے مقابلہ میں اہلِ کفر و شرک والحاد ہمیشہ اطاعتِ شیطان کی تعلیم دیتے رہے اور عقل انسانی کو اندھیرے (کفر = انگریزی کفر - جرمن کفر یعنی ڈھکنا) اور ظلمت میں رکھ کر جاہل انسانوں کو لوٹتے رہے اسی لئے اسلام کی تعلیم تھی لیخرجھم من الظلماتِ الی النور یعنی رحمان و شیطان کی کشمکش کی پوری تاریخ اسلام کے پس منظر میں پہلی جگہ کی مستحق ہے۔

(۲) ادیانِ عالم و ادیانِ جاہلیہ کو جاننے کے بعد خود اہلِ عرب کی سوشل حالت کو ان کی مادی و ذہنی تاریخ کو بھی پس منظر اسلام کا ایک جز سمجھنا ضروری ہے۔ پھر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اہلِ کتاب کی کیا حالت تھی، اور ان کی وہ حالت کیوں تھی

مخاطب کا ماحول اور سمجھ

مختصر یہ ہے کہ ہمیں قرآن کا مفہوم اسی طرح سمجھنا ہے جس طرح قرآن کے مخاطب اپنے ذہنی و مادی ماحول میں اسے سمجھتے تھے۔ یہ بات صحیح پس منظر پیدا کرنے سے ہی ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جن لوگوں سے تخاطب ہے ان کی عقول و افکار کی نوعیت جاننا بھی ضروری ہے۔

ترتیب نزول قرآن | (۱) خدائی نظم قرآن وہ ترتیب ہے جس ترتیب سے قلب رسول پر پہلے مکہ میں اور پھر مدینہ میں قرآن نازل ہوا اور لوگوں کو سنایا گیا۔ یا اگر صرف آنحضرت کے لئے تھا تو اس کے مطابق آنحضرت نے عمل کیا (اس کو وحی غیر متلو بھی کہہ سکتے ہیں)

عام طور پر مسلمان اس مصحف کی ترتیل کرتے ہیں جو حضرت عثمان غنی نے ۳۰ھ میں مرتب کرایا تھا لیکن سنہ ۳۰ھ سے پہلے یعنی رسول اللہ کے زمانہ میں اور شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس جن میں خود حضرت عثمان غنیؓ بھی شامل تھے قرآن کریم مختلف ترتیبوں سے محفوظ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مومنوں کے لئے چار سورتوں کا جاننا ضروری قرار دے دیا تھا اور خصوصیت کے ساتھ مومنات کے لئے حکم دیا تھا کہ وہ سورۂ نور ضرور سیکھیں۔

جو صحابی مثل حضرت عبداللہؓ بن مسعود یا حضرت علیؓ بن ابی طالب کے آنحضرت کے دامن سے وابستہ تھے۔ انھوں نے قرآن کو ترتیب نزول قرآن کے مطابق محفوظ کر رکھا تھا۔ غرضکہ قرآن کی حقیقی ترتیب وہ تھی جس ترتیب سے خدا نے اُس کو نازل کیا تھا۔ اُسے خدائی ترتیب کہتے ہیں۔

رسولی ترتیب اس کے بعد مختلف سورتوں میں رسول کریمؐ نے خدا کے حکم سے بعض آیات و الفاظ کا اضافہ کیا اور آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم کو فصل کے لئے استعمال کیا۔ یہ رسولی ترتیب مضامین فی السورہ ہے

خدائی ترتیب اور رسولی ترتیب دونوں کے متعلق روایت و درایت (خصوصاً حدیث عائشہ) سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا قرآن کس زمانے میں نازل ہوا اور اس کا مخاطب کون تھا۔ اہل علم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے،

کہ سیرت نبوی کو اور خود قران کو خدائی نظم و ترتیب یعنی ترتیب نزول قران کے مطابق سمجھیں۔ اس کے بعد رسولی نظم و ترتیب (جو یقیناً توقیفی تھی) سامنے لائیں۔ خدائی ترتیب سے وہ لوگ زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو سیرۃ نبوی اور اسلام کے پیغام کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ اگر اسی طرح سیرت نبوی نا مسلمانوں کے سامنے لائی جائے تو ان میں سے اکثر بہت جلد اسلام کی حقانیت کے اعتراف پر تیار بلکہ مجبور ہو جائیں گے۔ رسولی ترتیب ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور خدائی ترتیب نظم قران کا جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ ورنہ وہ اسلام کی معنوی یعنی روحانی کیفیت سے پورے طور پر فیضیاب نہ ہو سکیں گے۔ ہمارے مفسرین و فقہا اسے پیش نظر رکھتے ہیں اور احکام کے بیان کرنے میں شان نزول اور ترتیب نزول سے مدد لیتے ہیں لیکن سیرۃ نگاروں نے اس کا اہتمام نہیں کیا۔ اسی لئے سیرت و تفسیر دو الگ الگ فن بن گئے ان کا امتزاج سیرت نبوی کے ذریعے سے بہت آسان ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک قرانی سیرت لکھ چکے ہیں۔

ترتیب سور مصحف عثمانی مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ (۱) **خدائی ترتیب** وہ ترتیب ہے جس طرح مختلف اوقات میں قران کریم اللہ نے نجماً نازل کیا (۲) **رسولی ترتیب** وہ ترتیب آیات ہے جیسے رسول کریم نے خدا کے حکم سے مختلف سورتوں میں مرتب کیا اور بعض مکی سورتوں میں مدنی احکام جہاد و زکوٰۃ وغیرہ کو جگہ دی یہ ترتیب آیات فی السور ان لوگوں کے لئے بہت مفید تھی جو مسلمان ہو چکے تھے یا صحابہ سے براہ راست تاریخ قرآن و اسلام معلوم کر سکتے تھے (۳) موجودہ متداول ترتیب سور فی مصحف یعنی مصحف عثمانی ان کیلئے ہے

اسلام کی پوری تاریخ سے واقف ہیں یا کسی ایک امام فقہ کو مان لینے کے بعد اپنی زندگی ان کے بتلائے ہوئے راستے پر ڈھال چکے ہیں اس لئے ترتیل کے لئے مصحفِ عثمانی کی ترتیب سور صرف اُن مسلمانوں کے لئے موزوں ہے جو ایک مسلک فقہ پر قائم ہو چکے ہیں۔ لیکن محدثین کی کثیر تعداد کی رائے ہے کہ ترتیب سورِ قرآنیہ توقیفی نہیں ہے۔ امام مالکؒ۔ قاضی ابوبکرؒ اور ابن فارسؒ اسی گروہ سے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترتیب سور قرآنیہ صحابہ کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ مختلف صحابیوں نے اپنے اپنے مصحفوں کی ترتیبیں اپنے اپنے اجتہاد سے دے رکھی تھیں۔ ان ہی میں سے ایک مصحفِ عثمانی بھی ہے۔ البتہ قرآن کی بہت سی سورتوں کو رسول کریم ایک خاص ترتیب سے تلاوت فرماتے تھے (دیکھئے کتاب التبیان الجزائری)

۲۔ **تفسیر القرآن بالقرآن** قرآن وحی ہے جو منجانب اللہ ہے یعنی یہ شیطانی القایا وسواس الخناس سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی۔ علم الجمال کے جاننے والے جانتے ہیں کہ شعر یا تصویر میں زندہ تصورات و محسوسات کا ایک پر کیف، خوبصورت اور منظم امتزاج ہی نہیں ہوتا بلکہ ایسی وحدت ہوتی ہے جو تاریخ و منطق وغیرہ کے خشک واقعات اور محسوسات کو زندہ و لرزاں تصورات میں بدل کر الہام بنا دیتی ہے۔ اس الہامی کیفیت کا ظہور شعر یا تصویر کی صورت میں ہوتا ہے اس شعر یا تصویر کا یہ اعجاز ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے سامنے یہ پیش کیا جاتا ہے وہ مسحور ہو کر کیف و سرور سے معمور ہو جاتے ہیں۔ بقول حسرت سامع کا ساغر دل رنگِ بادۂ الہام سے پُر نور ہو جاتا ہے ؎

دِل کو خیالِ یار نے معمور کر دیا　　ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا

یعنی ؎ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
حق و صداقت کی خوبی، خیر و سعادت کا حسن، اور خود حسن و جمال کی جمیل کیفیات، عالمگیر و بے پایاں صداقتوں، رعنائیوں اور دلربائیوں کا مخزن ہوتی ہیں اور بقدر ذوق ناظر اُسے اپنی الہامی کیفیات سے متاثر کرتی ہیں اسی لئے کسی فنی شاہکار کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے آپ کو نہ صرف پس منظر سامنے لانا پڑتا ہے بلکہ فنکار کے دل و دماغ کے تاثرات و وجدانات کی گہرائیوں میں اس طرح داخل ہونا پڑتا ہے جس طرح اور جس نظم و ترتیب سے خالق شاہکار نے اپنی تخلیق کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسی لئے اگر آپ قرآن کی خدائی ترتیب کو پیش نظر نہ رکھیں، تو اس گلدستے کی حقیقی لطافت و جمال سے آپ محروم رہ جائیں گے اور صرف مختلف پھولوں کے غیر منتظم مجموعے کو دیکھ کر ایک کیفیت طاری کرنے کی کوشش کریں گے۔ خدائی نظم و ترتیب ایک گلدستہ ہے۔ رسولی ترتیب آیات نے مختلف سورتوں اور رکوعوں کو گویا پھول بنا دیا ہے صحابہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان پھولوں کو مرتب کر لیا تھا لیکن وہ سب جانتے تھے کہ خدائی نظم و ترتیب کیا تھی۔ ان میں سے اکثر اس گلدستہ سازی کے زمانے کی دشواریوں اور کاوشوں سے گذر چکے تھے اس لئے حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے تھے کہ میں نے ستر سورتیں رسول اللہ سے سیکھ کر محفوظ کی ہیں اور اُن کی نظم و ترتیب کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ سنہ ۳۰ھ تک قرآنی سورتوں کے مختلف گلدستوں سے کام لیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور صحابیوں کے خون سے بڑھ کر دوسرے مسلمانوں کا خون بہنے لگا حتیٰ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک یہ حالت ہو گئی کہ لوگ قرآن کے پس منظر (کلام جاہلیہ، معاشرت و ادیان جاہلیہ وغیرہ) کی تحقیق پر مجبور ہو گئے

تاکہ قرآن کی معنویت کو سمجھ سکیں۔ احادیث و اخبار ذسیر و مغازی آنحضرت ؐ کے زمانہ سے محفوظ ہو رہے تھے، اور قرآن کو سمجھنے کے لئے عظیم الشان لٹریچر تیار ہو رہا تھا

علم الجبال کے نقطۂ نظر سے پس منظر صورت ہے۔ اور نظم و ترتیب نزول قرآن معنی ہے۔ ان دونوں کے بغیر قرانی وحی سے وہ کیفیت و اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیئے۔

بارہ سو سال سے قرآن کی تفسیریں کی جارہی ہیں۔ اجل مفسرین نے لغت و حدیث کے ذریعے سے وحیِ ربانی کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش بلیغ فرمائی ہے۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ خود لغت کا تعلق معاشرتِ اقوام سے ہوتا ہے اس لئے لغات قرآن پر کافی مواد جمع ہو چکا ہے لغاتِ قرآن کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جائے۔ یعنی پہلے قرآن کو خدائی ترتیب تنزیل دے دی جائے اور پھر دیکھا جائے کہ مختلف مخاطبوں نے قرآن کے الفاظ و آیات کے کیا معنی سمجھے۔ اور خود قرآن نے کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولہم کو ملحوظ رکھ کر ان کو کس طرح اور کیا سمجھانا چاہا۔ اسی طرح قرآن خود اپنی تفسیر بن جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

(۱) قرآن کی تفسیر میں پہلا درجہ خود قرآن مختلف کتب سماویہ، تاریخ تمدنِ انسانی اور لغت عربی کا ہے بشرطیکہ قرآن کو تاریخی ترتیب سے سامنے رکھا جائے

(۲) اس کے بعد صحابیوں کا طبقہ ہے جو تفسیر میں مشہور ہوگئے۔ خلفاء اربعہ میں حضرت علی کی تفسیری روایتیں سب سے زیادہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایتیں حضرت علی سے بھی سے زیادہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو آنحضرت نے ترجمان القرآن کا نام دیا تھا۔ صحابہ میں حضرت انسؓ ۔ ابوہریرہؓ ۔ ابن عمرؓ

جابرؓ اور ابو موسیٰؓ سے بھی روایتیں ملتی ہیں۔

(۳) تابعین میں مجاہدؒ۔ سعید بن جبیر، الضحاک بن مزاحم، عکرمہ (مولیٰ ابن عباس) عطاء بن ابی رباح، محمد بن کعب القرظی وغیرہ اہم مشہور ہیں۔ یہ اقوال صحابہ بتایا کرتے تھے۔

(۴) تابعین کے دور کے بعد لوگوں نے اقوال صحابہ و تابعین کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان میں سفیان بن عیینہ۔ وکیع بن الجراح۔ عبد الرزاق۔ اسحاق بن راہویہ وغیرہ پہلے گذرے ہیں۔

(۵) ان کے بعد ابن جبیر الطبری نے تنقید کا دروازہ کھولا اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ یہ تفسیر بہت ہی اہم مانی جاتی ہے۔ اسی صف میں ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، الحاکم، ابن المقتدر وغیرہ بھی شمار کئے جاتے ہیں۔ (دیکھئے نووی: کتاب التہذیب)

(۶) اس کے بعد ہزار ہا تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ جو شخص جو فن جانتا تھا۔ اس کے ذریعہ سے تفسیر قرآن کرنے لگا۔ مثلاً

تفسیر نحوی۔ الزجاج۔ الواحدی۔ ابی حیان

تفسیر اخباری:۔ الثعالبی (اس سے بحث نہیں کہ قصص و اخبار صحیح ہیں یا نہیں)

تفسیر فقہی:۔ القرطبی

تفسیر فلسفی:۔ فخر الدین رازی (فی تفسیرہ کل شیئ الا التفسیر)

تفسیر مبتدع:۔ الزمخشری روایت کا انکار ہے (بقول بعض ملحد ہے)

نمونتہً ہم سورۃ الحمد کے قرآنی مفہوم کو درج ذیل کرتے ہیں اور سید رشید رضا مرحوم کی لفظ بلفظ تائید کرتے ہیں کہ ترجمہ ہر زبان کا مشکل ہے لیکن عربی اور وہ بھی وحی الہی دوسری زبانوں میں نہیں سما سکتی۔ بہر حال ہم کوشش کرتے ہیں

کرلیں منظرِ اسلام اور ترتیب تنزیل کی روشنی میں الحمد کی تین آیتوں کا قرآنی مفہوم ادا ہو جائے اور اس کے صوری و معنوی جمال کی انقلاب آفرینی کو اسی طرح سامع کے دل و دماغ تک پہنچے جس طرح یہ بلالؓ و صہیبؓ و میؓ تک پہنچی تھی۔

اس رسالہ کے آخر میں ہم وہ ترجمے بھی درج کئے دیتے ہیں جو ہمیں اب تک مل سکے ہیں اُن سے صاف ثابت ہو جائے گا کہ عربی زبان اپنی معنوی حیثیت سے اتنی رفیع و وسیع ہے کہ دوسری زبانوں کی کوتاہ دامنی اُس کی عظمت و پہنائی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

پرتو حُسنت نہ گنجد در زمین و آسماں — بسکہ حیرانم درون سینہ چوں جا کردۂ

امید ہے کہ وہ اربابِ علم و فکر جو قرآنی انقلاب سے دنیا کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ رکنِ انقلاب (سورۃ العلق) پیمانِ انقلاب (سورۃ الحمد) اور قرآنِ انقلاب (یعنی فتح حدیبیہ تک کے قرآن کو) جامعی طریقے پر مدون کرا کر دنیا کی مختلف زبانوں میں پیش کرنے کا تہیہ کریں گے۔ اور جو معاندینِ دینِ فطرت اس میں رکاوٹ ڈالیں ان سے اُلجھنے کی جگہ یہ کہہ کر الگ ہو جائیں گے کہ لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم، واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔

پیمانِ انقلاب

سورۃ الحمد کی تین آیتوں میں اس بات کا عہد و پیمان ہے کہ

(۱) ہم سوائے اللہ کے اور کسی کی غلامی نہ کریں گے۔ یعنی ہم غیر اللہ کی معبودیت کو ہرگز برداشت نہ کریں گے بلکہ اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیں گے اور صرف اللہ کے احکام کو غلاموں کی طرح

بے چون و چرا بجا لائیں گے یعنی راضی برضائے آقا رہیں گے۔

(۲) ہم اللہ کو مالک یوم الدین مانتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمیں کامرانی سے ہم آغوش کرے گا۔ وہ کسی عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اس کا قانونِ عدل اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمیں نیک عملی کی جزا کہیں نہ کہیں نہ ملے۔ لہٰذا اسی پر بھروسہ کر کے صرف اسی سے مدد مانگیں گے

(۳) ہم مغضوب علیہ ہونا سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔ غیروں کے آسرے کو چھوڑ کر صرف اس لئے ہم اللہ کے انعامات حاصل کرنے یعنی اس کے غلام بننے کو اپنا فخر سمجھیں گے۔ شرک کی بے راہ روی اختیار کرنے یعنی خدا کے وجود سے منکر ہو کر خسارے میں نہ پڑیں گے۔

محمد اجمل خاں
جمعہ ۲۳ مئی سنہ ۱۹۵۲ء

بیت الحکمت
سنگم کتاب گھر دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الحمد :- مکیہ و مدنیہ

ثلاث آیات

پہلے ہر سورہ کا نام اس کے ابتدائی لفظ سے ہوتا تھا۔ اس لئے اس سورۃ کا قدیم ترین نام سورۃ الحمد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس سورہ کو اپنے مصحف میں درج نہیں کیا تھا (ندیم فہرست ص ۴۲) حضرات حسینؓ و عکرمہؓ نے بھی جو ترتیب سور حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اس میں بھی سورۃ الحمد کا ذکر نہیں (سیوطی: اتقان ص ۱۰)۔ بہر حال یہ سورۃ الفاتحہ نہیں ہے۔ امام محی الدین نووی کا قول ہے کہ جماہیر سلف و خلف کا اتفاق ہے کہ اول مانزل من القرآن سورۃ اقرأ تا مالم یعلم ہے اور جابر کا یہ قول باطل ہے کہ المدثر پہلی سورت ہے۔

اس سورہ میں تین آیتیں ہیں۔ فضائل القرآن میں ابن الفریس کی کی روایت سے ثابت ہے کہ سورۃ الحمد مکہ میں ایک سورہ تھی۔ اس کے بعد اس میں مدینے جو جا با اضافہ کیا (اتقان ص ۱۰) عام طور سے سبع مثانی کی آیت کو پیش نظر رکھ کر سورۃ الحمد کی سات آیتیں بنائی جاتی ہیں جو نحوی اعتبار سے کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کی پہلی دو آیتیں تا ایاک نستعین مختلف اوقات میں مکہ میں نازل ہوئیں اور آخری آیت مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی جب یہودیوں سے تحویل قبلہ کے بعد بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ غرضکہ یہ کسی طرح سبع مثانی نہیں ہے۔ سورۃ الحجر میں سبع مثانی کا جملہ نزول الحمد سے

بہت پہلے کا ہے۔ الحجر کا نزول پندرہویں نمبر پہ ہے اور الفاتحہ سنہ نبوی کے بعد جب آنحضرت طائف سے واپس ہوئے ہیں تب اس کا نزول ہوا ہے۔ دونوں میں کئی سال کا فاصلہ ہے۔ سبع مثانی سے وہ سات (یعنی کئی) کتب سماویہ مراد ہیں جو آنحضرت سے پہلے نازل ہو چکی تھی گویا ان کتب کی تعلیم اور ان کے علاوہ قرآن عظیم رسول اللہ کو دیا گیا ہے (ولقد آتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم ۰ الحجر) اسی طرح سورۃ الزمر میں قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا کہ یہ حدیث کتب اولین سے متشابہ ہے (اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابھاً مثانی۔ الزمر ع۳)

بہر حال اس سورہ کے ننانوے نام بنا لئے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان میں سے اکثر کا تعلق سورۃ العلق سے ہے اس لئے کہ ترتیب تنزیل کے اعتبار سے وہی سورۃ الفاتحہ اور اعلان انقلاب ہے۔

مکّی قرآن کا پس منظر۔ غلامی، خوف اور جوع:

نزول قرآن کے وقت دنیا میں مختلف قسم کی غلامیاں رائج تھیں اور ان کو رائج کرنے والے ایسی جماعتیں بن گئے تھے جو لوگوں کو جاہل رکھ کر ان سے ان کی محنت کا ثمرہ حاصل کر لیتی تھیں۔ پروہتوں، ساحروں شاعروں، بادشاہوں، امیروں کی یہ جماعتیں لوٹنے والی جماعتیں تھیں اور بیچارے غریب اپنی جان، مال عزت، آبرو ان دھوکے بازوں کی تخویف سے ان کے واسطے قربان کر دیا کرتے تھے۔

ذہنی غلام تو سب تھے۔ حتیٰ کہ پروہت و ساحر بھی اپنے خود ساختہ

دیوتاؤں کو خوش کرنے کی تقلید جامد میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ جسمانی غلام یعنی جو اپنی محنت کی کمائی کو ان پروہتوں وغیرہ کے فریب پر نذر کرتے تھے۔ وہ بھی کم نہ تھے اور ساحروں اور کاہنوں کے پاس امیر و غریب کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ گویا آزاد غلام تھے جو ایک دوسرے کو جہل اور توہمات میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔

ایک قسم جسمانی غلاموں کی تھی جن کو عبادت کی بھی آزادی نہ تھی ان کے علاوہ آزاد عورتوں کا درجہ بھی غلاموں ہی کے مانند تھا۔ انھیں مندروں اور پوجا کرانے والے پروہتوں کے گروہ سے الگ رکھا جاتا تھا (اگرچہ توہم پرستی نے بہت سی پاگل عورتوں کو بھی کاہنہ بننے کا شرف عطا کر دیا تھا)

یوں کہنا چاہیئے کہ جہالت عام تھی اور بادشاہ سے لے کر ایک عام شہری تک سب ذہنی یا جسمانی غلامی اور توہمات میں مبتلا تھے۔ جسمانی غلامی کی سب سے تکلیف دہ صورت یہ تھی کہ آقا اپنی لونڈی یا باندی کے بچوں کو جانوروں کی طرح ماں کی گود سے چھین کر فروخت کر دیتا تھا اور آزاد لڑکیوں کو دیوتاؤں کے نام پر چڑھا کر زنا کرانے پر مجبور کرتا تھا۔ ویسے بھی باندیوں سے خرچی کموانا ایک عام بات تھی۔

غرضکہ غلامی کی وجہ سے جہل اور ان دونوں کی وجہ سے دنیا میں خوف اور بھوک عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ غلاموں کی فوجیں اپنے آقاؤں کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک آتی جاتی رہتی تھیں اور غلام ساز بادشاہوں اور پروہتوں کے دیوتاؤں اور خود پروہتوں کے لئے دولت

اور عورت کی تعداد بڑھاتی رہتی تھیں سوائے چند امرا اور پروہتوں کے سب کی حالت زار تھی اور خوشی و راحت صرف آئندہ جنم کے لئے ایک امید موہوم بن کر رہ گئی تھی

اسلام کا مقصد

اسلام یعنی خدا کی غلامی اور شیطان سے بغاوت کا دین ہمیشہ سے دنیا میں تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ شیطنت سے بچیں اور خدا کی بندگی کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کا منشاء ابتدائے عالم سے یہی تھا کہ انسانی عقل و ضمیر آزاد ہو اور وہ اپنے عمل میں شیطانی گرگوں کا پابند نہ ہو یعنی شفعا، یا کاہن و ساحر یا سلطان و امیر اپنے نفع کے لئے انسان کو جاہل اور تنگ نظر نہ بنا سکیں لوگ آزادی سے خدا پرستی یعنی نیک عملی کی صراط مستقیم پر چلیں اس میں خدا کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ بندوں یعنی غلاموں ہی کا فائدہ تھا۔

محی اسلام یعنی رسول عربی صلعم نے دیکھا کہ دنیا میں بہت سے ہادی و مصلح و نبی آچکے ہیں۔ سب کی تعلیم نیک عملی کی تھی سب خدا پرستی سکھاتے تھے اور شیطنت سے انسانوں کو ان ہی کے فائدے کے لئے دور رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ہر زمانہ میں ایسے گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں جو بغیر محنت دھوکے فریب سے روزی کماتے تھے اور لوگوں کو ذہنی و جسمانی غلام بناتے تھے۔ آنحضرت خود تاجر تھے اور ملکوں ملکوں میں پھر کر وحی ربانی سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ عاد و ثمود سے لے کر حضرت مسیح تک کی تاریخ شاہد ہے کہ حق پرستی چھوڑنے اور حق پرستی کے لئے انقلابی کوشش صبر و ثبات کے ساتھ نہ کرنے سے انسان گھاٹے میں رہتا ہے۔ (والعصر)

اسی لئے آنحضرت کی پوری زندگی اقتصادی اور معاشرتی اونچ نیچ کے دور کرنے کے لئے ایک مضبوط انقلابی پارٹی بنانے میں صرف ہوئی تاکہ یتیم متشکک اور مفلس کو پناہ، ہدایت اور دولت نصیب ہو (والضحیٰ ۲)

مدینہ میں فتح حدیبیہ تک انقلابی جماعت میں رخنے پڑتے رہے۔ مشرک اور یہودی منافقوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی کسر نہ باقی رکھی تھی۔ آخر حدیبیہ میں ایسی انقلابی جماعت بن ہی گئی جو منافقوں سے پاک تھی۔ اس کے بعد ہی پورا جزیرۃ العرب مسلمان یعنی اللہ کا مطیع ہوگیا

اس کے یہ معنی ہوئے کہ آنحضرتؐ کا مقصد دعوت یہ تھا کہ ایک ایسی اسلامی سوسائٹی بنائی جائے جس میں بدعملی ناممکن ہو جائے یعنی آپؐ نے نہ صرف مصلحوں کی طرح نیک عملی کا پیغام سنایا بلکہ مجبور کرکے نیک عمل بنانے والی سوسائٹی (کتابی آمریت قائم کرکے دکھا دی۔ اس سوسائٹی کی بنیاد ذہنی و جسمانی غلامی سے آزادی، اور اقتصادی مساوات کے جوہر پر تھی۔ ہر فرد (یعنی دولت کتابیہ کے شہری) کا بیت المال پر حق تھا اور ہر فرد پر دولت کتابیہ کے متعلق چند فرائض تھے۔ یہ حقوق و فرائض بہت کم مصلح یا ہادی اپنی زندگی میں مکمل طور پر قائم کرسکے لیکن آنحضرتؐ نے ایسی دولت (سلطنت) اللہ کی مدد سے قائم کر دی اور اقتصادی ناہمواری دور کرکے سماجی ترقی کی بنیادیں استوار کر دیں یعنی فرد اور سوسائٹی کا تضاد باقی نہ رہا۔ یہ کتابی سوسائٹی اس وقت سے انتشار کے عالم میں مبتلا ہوئی جب سے افراد نے جماعت کو اپنی اغراض کا آلۂ کار بنانا شروع کیا۔ پہلے دولت اسلامیہ میں انفرادی آزادی اور جماعتی آمریت دونوں کا توازن قائم تھا۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی میں اس توازن کو رجعیوں نے ختم کرنے

کی کوشش کی۔ لیکن ہر زمانہ میں ایسے مجدد اور مصلح پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس توازن کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ فجزاھم اللہ خیرا

عنوان انقلاب یعنی وحی اوّل اصل میں دعوتِ انقلاب سورۃ العلق کے دو بنیادی تصورات میں مضمر ہے۔

اور دنیا کے دو بنیادی جھگڑوں کو اس کی پانچ آیتوں نے ہمیشہ کے لئے یقین کے رخ پر ڈال دیا ہے۔ فلسفی اور سائنٹسٹ اب تک حیران ہیں کہ ماہیت وجود کیا ہے اور علم کی کیا حقیقت ہے۔ ان دونوں کے متعلق جو نظریات وجود و نظریاتِ علم بنائے گئے ہیں، ان کو دیکھئے تو شک و یقین یعنی ضلالت و ہدایت کی پوری تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی اور انسانی سوسائٹی کی سیاسی، اخلاقی، مذہبی و اقتصادی پامالی کی پوری تاریخ واضح ہو جائے گی

سورۃ العلق نے بتایا کہ حقیقت صرف روحانی حقیقت ہے۔ ہر وجود ایک ہی مرکز سے عالم امکان میں آیا ہے اور علم و سائنس یعنی کلمات اللہ و سنت اللہ کا منبع بھی رب (آقا) ہے جو اول و آخر، ظاہر و باطن بھی ہے اور رب السموات رب الارض اور رب العالمین بھی ہے۔ مختصر یہ کہ وسواس الخناس کی فسادی و اخلاقی شیطنت کو ختم کر کے دنیا کو ... انقلاب سے روشناس کرنا وحی اول کا مقصد عظیم ہے۔ صرف اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بعد کا قرآن نازل ہوا جو مختلف تاریخی ادوار سے گذرا جو صرف ترتیب نزول قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے

سورۃ الحمد اور انقلاب سورۃ الحمد کی ابتدائی دو آیتیں مکی ہیں۔ آخری آیت مدنی ہے۔ اس میں بھی سورۃ العلق کا وہی انقلابی پیغام موجود ہے جس نے دنیا کو شک سے نکال

کر یقین کا، شیاطین کی غلامی سے نکال کر اصلی آقا کی بندگی کا راستہ دکھایا۔ اسے پیمانِ انقلاب کہیں تو بجا ہے

پس منظرِ اسلام اور ترتیب نزول قرآن

اب ہماری کوشش ہے کہ سورۃ الحمد کو اس کے تاریخی پس منظر اور قرآن کی تاریخی ترتیب کی روشنی میں دیکھیں سورۃ الحمد کا نصف اول آنحضرت کے شعب سے نکلنے اور طائف سے واپسی کے بعد نازل ہوا۔ پھر آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی جہاں یہود و نصاریٰ تھے اور صراط کا لفظ عام طور سے رائج تھا اور جس جگہ مغضوب علیہم سود خوار مغرور پناہ گزینوں کی بڑی تعداد تھی۔

ترتیب نزول اور سورۃ الحمد

شعب ابی طالب سے سنہ ۱۰ نبوی میں تین سال کے مصائب سے نجات ملی تو آنحضرت طائف تشریف لے گئے۔ شعب میں منجملہ اور سورتوں کے سورۂ یوسف نازل ہوئی جس میں سورۃ الحمد کا پورا تصور موجود ہے۔ پھر طائف سے واپسی کے بعد مکہ میں سورۃ الجن نازل ہوئی جس سے "عالمین" کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ اسی زمانے میں جبکہ سیدہ خدیجہؓ کی وفات ہو چکی تھی، جناب ابو طالب بھی انتقال کر چکے تھے اور مکہ کا ہر شخص خون کا پیاسا تھا، سورۂ اسراء نازل ہوئی جس میں بنو اسرائیل کی طرف توجہ کا اشارہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دنیا میں کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی کہ آپؐ قطعی ہراساں اور نا امید نہیں ہوئے اور صبر و صلوٰۃ سے خدا کی مدد کے یقین پر تبلیغ فی القبائل کرتے رہے۔ سورۃ الحمد اسی کشمکش اور ابتلا کے زمانہ کی یادگار ہے۔ اس لئے سورہ یوسف اور سورۂ جن کا مطالعہ

ضروری ہے تاکہ صبر و صلوٰۃ اور حمد و استعانت کا حقیقی مفہوم واضح ہو جائے۔

سورۃ الحمد اور سورہ یوسف

کسی تفسیر میں دیکھیئے، آپ کو یہ نہ معلوم ہو گا کہ جب
۱۔ پس منظر آنحضرت شعب ابی طالب میں بنو ہاشم اور بنو المطلب کے ساتھ محصور تھے اور مقاطعۂ قریش کے مصائب برداشت کر رہے تھے تو اس وقت کون سا قرآن نازل ہوا تھا اور اس کا مخاطب کون تھا؟ کیا صرف وہ تین چار افراد تھے جو مومن ہو چکے تھے یا روئے سخن بنو ہاشم و بنو مطلب کی طرف تھا، جو اگرچہ مسلمان نہ تھے لیکن آنحضرتؐ کے بچانے میں مقاطعہ کے مصائب برداشت کر رہے تھے یا یہ کہنا چاہیئے کہ اس زمانہ کے قرآن کا مقصود یہ تھا کہ رسول اللہ اس کی روشنی میں آئندہ کا پروگرام بنائیں۔

جہاں تک قرآن و سیرت سے معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اس زمانہ کے قرآن میں آپ کو قیام دولت کتابیہ کا پیغام دیا گیا تھا اس لئے شعب سے نکلنے کے بعد آپ نے نہایت سرگرمی سے قیام دولتِ کتابیہ کا کام شروع کر دیا۔

سورۂ یوسف شعب کے محاصرہ کے زمانہ کی تعلیم ہے۔ یہ ان ہی حالات میں دنیا کے بے کسوں اور مجبوروں کے لئے پیغام ربانی ہے یعنی اس کی روشنی میں وہ کام کریں تو یقیناً نصرت الٰہی اور فتح ان کا ساتھ

دے گی۔ نصف سورۃ الحمد شعب سے نکلنے کے بعد سنہ ۱ھ نبوی میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کے متفرق مضامین اس سے پہلے کی سورتوں میں بیان ہو چکے ہیں۔

سورۂ الحمد کا پس منظر یہ ہے کہ جس طرح حضرت یوسف باوجود برادران یوسف کی شرارتوں کے خود مصری عورتوں کے پاجی پن سے زندانی بننے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح رسول اللہ کو اپنے ہم وطنوں اور رشتہ داروں کی شرارت سے شعب میں محصور اور بہت سوں کو حبشہ جلا وطن ہونا پڑا۔ آخر رب العالمین نے ان کی مدد کی اور سب برادران یوسف کی طرح آنحضرت کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ اور آنحضرت نے فتح مکہ کے بعد مثل یوسف کے یہ کہا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔

لیکن اس شرط کو پورا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ سلطنت قائم کی جائے اور جتنی فرعونی طاقتیں ہیں جو ارباب من دون اللہ کو مانے ہوئے ہیں وہ فنا کی جائیں اور پھر الحکم لو مئیذ اللہ کو سب مان لیں گے۔ اسی لئے اس سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ناامیدی سے پہلے نصرت الہی پہنچ جاتی ہے (حتّٰی اذا استیأس الرسل وظنّوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا فنجّی من نشاء ط ولا یردّ باسنا عن القوم المجرمین۔

نظم سورۂ یوسف

اگر ہم اس سورہ کے مضامین کی نظم و ترتیب پر نظر رکھیں تو یہ قصہ نہیں بلکہ قیام سلطنت کتابیہ کا ایک پروگرام بن جاتا ہے۔ ہمارے عوام میں یہ قصہ عرصۂ دراز سے بہت مقبول ہے یہود و نصاریٰ بھی اسے توریت کے ان چند بے مثل قصوں میں شمار کرتے ہیں جن سے آج تک دنیا والوں کو مسرت بے پایاں حاصل

ہوتی ہے ۔ عجاردہ (خوارج کی ایک شاخ) نے بھی اسے قصہ سمجھا تھا۔ اور یہ رائے قائم کرلی تھی کہ یہ قرآن کا جزء نہیں ہے ۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں حسن و عشق کا قصہ بیان کرنا خدا کی شان سے بعید ہے" (شہرستانی عجاردہ) بہرحال مسلمان بھی اسے قصہ ہی سمجھتے رہے اور اردو میں تو اسے منظم کا جامہ بھی پہنایا گیا۔

لیکن یہ قصہ نہیں بلکہ موعظت ہے ۔ یا مجبور و مقہور لوگوں کے لئے ایک آزادی کا پیغام ہے ۔ اس سورہ میں "نحن نقص علیک احسن القصص" کے الفاظ بھی آگئے۔ اس لئے قصص کو قصہ (یعنی کہانی) کی جمع سمجھ لیا گیا ۔ حالانکہ خود نقص کے معنی بیان کرنے کے ہیں کہانی کے نہیں ہیں ۔ یعنی جس طرح پہلے کہا گیا تھا کہ قرآن احسن الحدیث ہے ویسے ہی بیان کہا گیا کہ یہ احسن القصص یعنی بہترین بیان ہے ۔ اس کے آگے ہی لا تقصص رویاک ہے یعنی اپنا خواب بیان " نہ کر ۔ اسی لئے اس سورہ کے شروع میں صاف صاف کہدیا گیا کہ یوسف اور ان کے بھائیوں کے حال میں پوچھنے والوں (یعنی نہ جاننے والوں) کے لئے بہت سی نشانیاں (تنبیہیں) ہیں (لقد کان فی یوسف و اخوتہ آیات" للسائلین ۝ اور آخر سورہ میں فرمایا لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب

غرض کہ شعب ابی طالب میں اس سورہ کی اصلی جگہ ہے اور یہ محض افسانہ نہیں ہے بلکہ مردہ قوموں کی زندگی بخشنے اور آزاد کرنے کا پیغام ہے حسن حیا روزہ کی کشش، مال و دولت کی طمع کی طرح انسان کو فریب میں ڈال کر اسے خیانت و سرقہ پر مائل کرسکتی ہے لیکن جو فرشتہ خصال (ملکہ

ہو اس کے سامنے قریش کی شاہی اور حسین ترین عورت کی پیشکش ایک بے معنی چیز ہی نہیں بلکہ خیانت ہے ۔ اسی لئے اسی سورۃ میں فرمایا کہ یہ موعظت بغیر کسی لالچ یا اجرت کے دی جاتی ہے ۔ اصل میں حضرت یوسف ؑ کے پیرایہ میں یہ رسول کریم کے نفسیاتی کیفیات کا نقشہ ہے ۔

غرضکہ گلدستۂ قرآنی میں جس جگہ سورۂ یوسف کا پھول اللہ نے لگایا تھا وہیں اس کا حسن نمایاں ہو سکتا ہے ، ورنہ اسے افسانہ سمجھئے یا تاریخ اصل نکتہ حل نہیں ہوتا ۔

اس سورۃ پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جو مضامین سورۃ الحمد میں بیان ہونے والے ہیں ان میں سے اکثر اس سورۃ میں بیان کر دئے گئے ہیں ۔ گویا سورۃ الحمد کے اجمال کی تفصیل سورۂ یوسف میں ہے

رب یعنی آقا کو ان آیتوں میں دیکھئے ۔

(ا) قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوائ ۲۳ (یوسف نے زلیخا سے کہا کہ تمہارا شوہر میرا آقا ہے ۔ اس نے مجھ غلام کو اچھی طرح رکھا ہے ۔

(ب) ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار ۳۹ (کیا یکتا و یگانہ وزبردست اللہ کے علاوہ کئی آقاؤں کو ماننا اچھی بات ہے

(ج) اما احدکما فیسقی ربہ خمراً ۴۱

یعنی وہ قیدی جس نے انگور دیکھا ہے وہ اپنے **آقا** کو شراب پلائے

(د) پھر اس سے حضرت یوسف ؑ نے کہا جب رہا ہو جانا تو اپنے رب (آقا) سے میرا ذکر کرنا ۔ لیکن وہ اپنے آقا سے کہنا بھول گیا اور حضرت یوسف کو چند

اذکرنی عند ربک فانساہ
سال مزید قید میں رہنا پڑا۔ (وقال.... اذکرنی عند ربک فانساہ
الشیطان ذکر ربہ ۔ فلبث فی السجن بضع سنین۔ (۴۲)
(ک) پھر جب بادشاہ نے ساقی کے ذریعہ حضرت یوسف کو بلایا تو انھوں نے کہا
جا اپنے آقا (رب) سے کہدے کہ پہلے میرے الزام کو ہٹالے اور ان
عورتوں سے باز پرس تو کرے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے۔
(وقال الملک ائتونی بہ ٥ فلما جاءہ الرسول قال ارجع الی ربک
یعنی آقا کے پاس۔
(د) اسی آیت میں ہے۔ عورتوں کے مکر سے میرا آقا (جس نے مجھے خریدا
تھا۔ واقف ہے (ان ربی بکیدھن علیم (۵۰)
غرضکہ رب کے معنی قرآن سے بھی ثابت ہیں کہ وہ آقا یا خواجہ یا مالک کے
لئے استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ اصلی آقا اللہ ہے لہذا اسے بھی رب کہا گیا اور بتایا
کہ وہ سب آقاؤں کا آقا ہے۔

اَلعالَمین (انسان - قومیں - لوگ) اسی سورہ میں زبان وحی سے
رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے یہ خبریں خدا کی وحی سے معلوم
ہوئی ہیں۔ حالانکہ میں برادران یوسفؑ کے اس اجتماع میں جبکہ وہ مکر
کی باتیں سوچ رہے تھے موجود نہیں تھا۔ لیکن باوجود اس کے اس سے
جو عبرت حاصل ہوتی ہے وہ بغیر خدا کی وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی تھی بہر حال
میں کتنا ہی چاہوں منکرین حق اس کو نہ مانیں گے وہ عبرت نہ حاصل
کریں گے۔ باوجودیکہ میں اس موعظت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور
کل انسانوں کو بغیر کسی معاوضے یا صلے کے نصیحت کرتا ہوں۔
(وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین (۱۰۳) وما تسئلھم علیہ

من اجرٍ ط ان ھو الا ذکر للعالمین (۱۰۴)
صاف ظاہر ہے کہ نصیحت انسانوں کو ہی دی جاتی ہے لہذا عالمین کے معنی سوائے انسانوں یا قوموں کے کسی طرح اور کچھ نہیں ہو سکتے

الرحیم (فضل وکرم مہربانی غلامی سے آزادی وحصول سلطنت) اللہ کی رحمت یا مہربانی یہ ہے کہ اس دنیا میں سوائے اللہ کے کسی کا محتاج نہ ہو جب وہ کسی اور کا بندہ نہ ہوگا تو یقیناً وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہو کر آزاد سلطنت کا فرد ہوگا۔ اس لئے حضرت یوسف پر جو رحمت نازل کی گئی وہ یہی تھی کہ شاہ مصر نے انہیں خزائن مصر پر افسر مقرر کر دیا اور وہ غلامی سے نکل کر آزاد ہو گئے موجودہ دنیا میں خدا کی یہ رحمت برابر محسنوں پر ہوئی رہتی ہے دیکھئے (وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منہا حیث یشاء نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین (۵۶) یعنی اس دنیا میں محسنوں یعنی خدا پرستوں کو بدلہ مل جاتا ہے وہ ضائع نہیں ہوتا۔

یوم الدین (قانونی فیصلہ کا دن) یعنی آج یہاں دنیا میں جو کام کئے ہیں ان کا اجر ملے ہی گا۔ لیکن ممکن ہے کہ بعض اس کشمکش حق و باطل میں شہید ہو جائیں تو ان کا اجر قیامت میں ملے گا یعنی متقیوں اور ایمان والوں کو بہت بڑا معاوضہ ملے گا۔ (ولاجر الآخرۃ خیر للذین آمنوا وکانو یتقون (۵۷) یہاں تقوی کے معنی بھی ظاہر ہو جاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو مثل یوسف کے برے کاموں سے بچتے ہیں۔ یعنی جس طرح حضرت یوسف خیانت سے بچے اور اپنے آقا کی ملکیت میں تصرف نہیں کیا یعنی زلیخا سے زنا نہیں کی

زنا یاد رکھئیے کہ قدیم تصور کسی منکوحہ عورت سے زنا کا یہی تھا کہ وہ دوسرے کے مال کی چوری یا خیانت ہے ۔ اسی لئے حضرت یوسف نے فرمایا کہ میں نے اپنے آقا کے پیٹھ پیچھے اس کے مال میں خیانت نہیں کی (ذالک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب وان اللہ لا یھدی کید الخائنین ﴿۵۲﴾) بہت سی قدیم سوسائٹیوں میں زنا کی بھی سزا وہی تھی جو خیانت کی ہوتی ہے (دیکھئے قوانین سمیریہ و قوانین حمورابی)

سرقہ اور چوری کی سزا یہ تھی کہ چور کو مال مسروقہ کے مالک کا غلام بننا پڑتا تھا ۔ سورہ یوسف میں جزائہ کے یہی معنی ہیں کہ جس کے بورے میں پیالہ نکلے وہ اس کا غلام بنا دیا جائے

فھو جزاؤہ ۔ کذالک نجزی الظالمین ﴿۷۵﴾

ملک یوم الدین (یوم الفصل میں فیصلہ کرنے والا، یا قاضی) الحمد للہ کے سلسلے میں جو آیت ہے اس میں اسی یوم الفصل کو آخرۃ کہا گیا ہے ۔ چونکہ مومن کے لئے اللہ کو قانونی فیصلہ کنندہ ماننے کے لئے یوم البعث پر یقین رکھنا ضروری ہے اسی لئے حضرت یوسف نے فرمایا (انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ ۔ وھم بالآخرۃ ھم کافرون ﴿۳۷﴾ یعنی ایمان باللہ ہی میں ایمان بعث الموت اور یوم الفصل میں خدا کے قاضی یا ملک ہونے کا تصور مضمر ہے ۔ اسی لئے حضرت یوسف نے فرمایا کہ ربا تو بادشاہ ہے ۔ تو نے مجھے ملک عطا کیا (رب قد آتیتنی من الملک)

ایاک نعبد (عبد یعنی غلام) سورہ یوسف میں فرعون مصر کو ملک یعنی شاہ مصر کہا ہے ۔ اور اسی کے لئے اس

آیت میں "رب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ چونکہ دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ اس لئے ہر آقا کو رب کہتے تھے اور سب آقاؤں کا جو خداوند یا بڑا آقا شہنشاہ ہوتا تھا اسے ملک کہتے تھے۔ اسی کے ہاتھ میں لوگوں کی جان، مال، عزت آبرو ہوتی تھی اور اسی کے چشم و ابرو کے اشارے پر ہزارہا سر تن سے الگ، یا ہزاروں مفلس الدار ہو جاتے تھے ان ہی غلاموں میں سے ایک حضرت یوسفؑ تھے جو ایک قید کی کوٹھری سے نکل کر بادشاہ کے حکم سے اس کے وزیر اور خزانچی ہو گئے کس مپرسی سے شعب میں یہی تصور آنحضرتؐ کے سامنے لایا گیا کہ خوف و حزن کو دور کرنے والا وہی رب ہے جو ملک الملک ہے۔ وہ اس دنیا میں بادشاہت اور آئندہ دنیا میں جزائے خیر دے گا۔ صرف اسی پر بھروسہ کرنے اور صبر و ثبات سے مصائب کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

نوٹ: یہاں ایک اور بات غور طلب ہے کہ قرآن نے فرعون کا لقب استعمال نہیں کیا بلکہ ملک کا لفظ کہا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں شاہان مصر نے اپنے لئے فرعون کا خطاب شروع نہیں کیا تھا۔ ماہرین مصریات کا خیال ہے کہ یہ ایک لقب ہے اور ابتدائی سلطنت کے بادشاہوں کے نام کے ساتھ یہ لقب نہیں ہے۔

(فرعون کے کئی معنی ہیں یا تو وہ مصری دیوتا کو کہتے تھے جو مصری تثلیث کا ایک اقنوم ہے اور عقاب کی شکل کا ہے۔ یا ایک فاتح عقاب کو کہتے تھے یعنی اس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ سورج دیوتا "را" کا اوتار یا بیٹا ہے۔ اس کے معنی آقا (ابّی) کے بھی تھے۔

ایاک نستعین کے معنی واللہ المستعان علی ما تصفون سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے "صبر جمیل" کا بلیغ جملہ ہے جو حضرت یعقوب نے مرگ یوسف کی خبر پر کہا اور صرف

اللہ پر بھروسہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ یعنی موت ہو یا زیست ہر حال اور ہر مصیبت میں صبر و صلوٰۃ کے ساتھ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اور اسی سے مدد مانگنا چاہیئے۔ یہاں اَسْتَعِیْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ کے معنی بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

(اسید صحی شانہٗ یعنی اسلام۔ خدائے واحد کی)

الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْم کی عبودیت کا طریقہ) اسورۂ یوسف میں اُسے دین القیم کہا ہے۔ دین بمعنی راستہ، مذہب طریق سبیل یا صراط ہے اور قیم وہی ہے جو مستقیم ہے۔ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ دین قیم یا صراطِ مستقیم کیا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی (عبودیت) نہ کرو۔ یعنی اس کے سوا کسی دوسرے آقا کا حکم نہ مانو۔ یہی اسلام ہے۔ یہی سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے دیکھیئے (اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ذٰالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ صوفیائے کرام اسی کو راضی برضائے الٰہی ہونا کہتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ الانبیاء میں فرمایا وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

یہ عبودیت کا مرتبہ اور راضی برضا ہونے کا شرف صرف اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب بندہ دوسرے ارباب سے منہ موڑ لے اور صرف ایک "رب" یا آقا کا ہو رہے۔ اُسی کی رضا یا اُس کے احکام خود بخود اس کے قلبِ منیر پر روشن ہوتے ہیں گے بقولہٖ: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (سورۃ العلق) یعنی عنوانِ انقلاب کا مطالعہ اس سلسلے میں ضروری ہے۔

الحمد للّٰہ شکرگذاری سوائے خدا کے کسی اور آقا اور آقاؤں کی جائز نہیں ورنہ یہ شرک ہے۔ اللہ کو ماننے کے معنی یہی ہیں کہ وہی خالق ہے اور آخرۃ میں پیدا کرنے والا بھی وہی ہے وہاں وہ ہمارے اعمال کی جزا دے گا۔ یہی دین ابراہیم ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ میں نے ان لوگوں کے طریقے کو چھوڑ دیا ہے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ آخرت کو۔ اِنِّی تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاۗءِیْ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۭ یعنی شرک نہ کرنا اور خدائے یکتا کو ماننا ہی حمد ہے۔ یہی شکر بمقابلہ کفر ہے۔

اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اس آیت ہی میں آگے بتایا ہے کہ خدا کا انعام یا فضل کیا ہے فضل یہی ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کو آقا نہ مانیں اور انسانی عزت و شرف کو غیر اللہ کی بندگی کر کے خاک میں نہیں ملائیں۔ موحد اور خدا پرست ہونا ہی اللہ کا فضل و انعام ہے۔ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ یعنی مشرک نہ ہونا اور موحد ہونا ہی اللہ کا فضل و انعام ہے

وَلَا الضَّآلِّیْنَ (بھول چوک، غلطی، شک، دھوکا، کسی کے بہکانے سے بہک جانا) **ضلال**۔ غلطی چوک۔ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ مصر کی عورتوں نے کہا یقیناً زلیخا کو اس کے غلام نے لبھا لیا ہے اور ہم اسے ہم صریح غلطی (بھول چوک) میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

ضلال: دھوکا۔ شک۔ جب برادران یوسفؑ حضرت یوسفؑ کا پیرہن لے کر آئے تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ یوسف کے پیرہن کی بو آتی ہے،

برادران یوسف نے کہا کیا خوب! آپ ابھی ابھی پرانے شک یا
دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ یوسف زندہ ہے۔
قالو ا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم ۹۲

قرآن کا روئے سخن کس کی طرف ہے

قرآن کا ترتیب نزول کے مطابق

مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اُن صاحب شعور لوگوں کے لئے ہے جنہیں اختیار دیا گیا ہے کہ وہ موجودہ زندگی میں اچھا راستہ اختیار کریں یا بُرا راستہ۔ اسی لئے اس کو ذکرٌ للعالمین " کہا گیا ہے۔ اس کے لئے تذکرہ، ذکریٰ۔ قول فصل۔ بیان۔ ھذا الحدیث۔ الحق۔ مثل ما انطقون ھدیٰ۔ امام۔ رحمۃ۔ الکتاب۔ حکمہ۔ فصل خطاب۔ قرآن عربی۔ وحی۔ فرقان ذکر مبارک۔ بلاغ مبین۔ احسن الحدیث۔ کتاباً متشابہاً مثانی۔ لبصائر۔ القول الثابت۔ نور۔ آیات بینات۔ شفاء۔ کتاب عزیز۔ قرآناً عجباً بشریٰ۔ القائے حکیم۔ موعظت۔ تفصیل الکتاب۔ الروح کہا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ وبشارت غیر ذوی العقول کے لئے نہیں ہو سکتا (تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعالمین نذیرا ۝ الذی لہ ملک السموات والارض ولم یتخذ ولد اً ولم یکن لہٗ شریکٌ فی الملک (الفرقان) یعنی عالمین کو خبردار کرنے کے لئے اپنے عبد (بندے) پر بادشاہِ ارض وسماء نے اس فرقان کو نازل کیا ہے۔ اُسے بیٹے کی ضرورت نہیں۔ کہ مرنے کے بعد وہ اُس کا وارث ہو۔ اس لئے کہ وہ حیّ وقیوم ہے اور اُس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں عبودیت اور جبر و اختیار

قرآن میں سورۃ العلق پہلی سورۃ ہے اس میں خالق کائنات کو رب یعنی آقا کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعد کی سورتوں میں بھی جو خدا کی صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ربوبیت یعنی خواجگی کا تصور موجود ہے۔ مثلاً ملک الناس۔ الہ الناس۔ قادر۔ خالق۔ عظیم۔ عزیز کبیر (بادشاہ)۔ ذی العرش (بادشاہ) ذو القوۃ۔ ذو الجلال والاکرام احسن الخالقین۔ وہاب۔ قہار۔ خلاق۔ مقتدر۔ ملک الحق۔ ملکوت کل شیٔ۔ فاطر السموات والارض وغیرہ

جبر اور عالم ناسوت و ملکوت

رب کے مقابلے میں عبد کا لفظ ہے یعنی آقا کا بندہ یا غلام یعنی خدا کے خالق کی وہ مخلوق جس کی حیثیت ایک ادنیٰ غلام کی سی ہے۔ خدا کی مخلوق میں جاندار اور بے جان چیزیں دونوں داخل ہیں۔ جہاں تک بے جان چیزوں کا تعلق ہے انہیں خدا نے اختیار نہیں دیا کہ وہ امر رب سے سرتابی کر سکیں انہیں مجبوراً یعنی طوعاً و کرہاً قوانین قدرت کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ اسی واسطے قرآن نے کہا ہے۔

۱۔ للہ یسجد ما فی السماوات والارض طوعاً وکرھاً (الرعد) — آسمان و زمین کی ہر چیز مجبور ہے کہ وہ خدا کے حکم پر چلے (الحدید (الرعد)

۲۔ یسبح للہ ما فی السماوات والارض وھو العزیز الحکیم ۰ لہ ملک السماوات والارض یحیی ویمیت وھو علی کل شیٔ قدیر (الحدید) — زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے وہ کمال قدرت اور حکمت والا ہے۔ سارے آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہی ہر چیز پر قادر ہے (الحدید)

ان ہی بے جان مخلوقات کی مانند' قرآن میں ایک اور مخلوق کا ذکر کیا ہے جو غیر ذی شعور اشیاء کی مانند خدا کے احکام کو بے چون و چرا بجا لاتے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سرتابی عصیان، طغیان کی طاقت ہی نہیں وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خدا کے ہر امر کو بجا لائیں یعنی وہ ایسے عبد ہیں جو اپنے آقا کے امر کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں۔ ان کو قرآن نے کہیں ملک کہا ہے، کہیں حافظ و رقیب، کہیں کراماً کاتبین، کہیں جنود اللہ المقربون، رسول کریم، مرسل، روح، روح الامین، روح القدس الذین یحملون العرش، رسلاً اولی اجنحہ، حرس شدید' امر رب کہا ہے۔ یہ ملک' فرشتے یا خدا کے فرماں بردار' غلام اپنا کام پوری امانت سے کرتے رہتے ہیں تسبیح رب یعنی احکام رب کی تعمیل پر مجبور ہیں۔ ان کی خلقت ہی ایسی بنائی گئی ہے

اس لئے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ قرآنی انذار و نصیحت ان کے لئے نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی مخلوق، اگرچہ اس کی غلام ہے لیکن اشیائے غیر ذی شعور، اور فرشتے دونوں کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ بندگی و غلامی پر مجبور ہیں۔ انھیں اس کا اختیار نہیں کہ وہ اوامر ربانی سے سرتابی کریں اس لئے ان کے اعمال کی پرسش ہے نہ جزا سزا۔ اسی لئے قیامت میں عالم ملکوت و عالم ناسوت سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا یہ دونوں عالم مجبور ہیں مختار نہیں ہیں۔

اختیار اور جن و انس قرآن اس مخلوق کے لئے ہے جسے اختیار ہو کہ وہ دنیا میں نیک عملی کا رستہ اختیار کرے یا بدعملی کا (وھدینٰہ النجدین : اور ہم نے اسے دونوں راستے بتا دئے) یہ صاحب اختیار

اور ذی شعور ہستی انسان کی ہے۔ اسی لئے قرآن الحکیم صراط مستقیم یعنی اللہ کی غلامی کا رستہ بتانے کے لئے آیا ہے۔

لیکن انسان کے ساتھ ساتھ قرآن نے بارہا جنات کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً الخناس جن اور انس دونوں ہوتے ہیں (سورۂ والناس) یا سورۂ الرحمان میں بار بار جن و انس کو مخاطب کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان مٹی سے اور جنات آگ کے شعلے سے بنائے گئے ہیں (خلق الانسان من صلصال کالفخار ٥ وخلق الجان من مارج من نار) اسی سورہ میں جن و انس کو ثقلان یعنی دو گروہ بتایا ہے اور پوری سورۃ میں یہ بتایا ہے کہ دونوں گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہیں جو اللہ کی نعمتوں (آلاء اللہ) کو جھٹلاتے رہیں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ قیامت کے دن انس و جن سے ان کے گناہوں کے متعلق نہ پوچھا جائے گا (فیومئذٍ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان) بلکہ گنہگاروں کے چہرے ہی ان کے جرائم کی گواہی دیں گے

غرضکہ قرآن سے ثابت ہے کہ آقائے ذوالجلال کی بندگی و عبودیت کے لئے جن و انس پیدا کئے گئے (ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ٥ الذٰریٰت) اور اس بندگی پر نہ تو عالم انس مجبور ہے نہ عالم جن بلکہ وہ بخلاف عالم ناسوت و عالم ملکوت کے مختار ہیں کہ وہ اپنے رب (آقا) کے احکام کو بجالائیں یا اُن کی تکذیب کرکے سرتابی کریں۔ بہرحال وہ اس دنیا میں مختار ہیں اور یوم الدین میں انھیں اس اختیار کے صحیح یا غلط استعمال کی جزا اور سزا ملے گی

سورۂ جن اور سورۃ الحمد

سنہ نبوی میں طائف سے واپسی کے بعد آنحضرت نے نخلہ گاؤں میں قیام فرمایا تھا۔ اسی مقام پر سورۃ الجن نازل ہوئی تھی جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ جنوں کو آنحضرت نے دیکھا نہیں لیکن وحی ربانی سے معلوم کیا کہ انھوں نے قرآن کو سنکر کہا کہ یہ کلام عجب ہے (قُل اوحِیَ اِلیّ اِنّہ اسمع نفر من الجن فقالوا انّا سمعنا قرآناً عجباہ یھدی الی الرشد فآمنّا بہ ولن نشرک بربنا احداً) اور وہ اس پر ایمان لے آئے اور اپنے رب کے شرک سے توبہ کی (یہاں شرک کے معنی بھی صاف ہو جاتے ہیں کہ اپنے آقا (رب) کے حکم کے سوا کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے)

بہرحال جن بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مسلم (فرماں بردار) دوسرے قاسط (نافرمان) (وَاَنّا منا المسلمون و منا القاسطون : سورۂ جن)

صراط مستقیم اور سورۂ جن فمن اسلم فاولٰئک تحرّوا رشداً۔ یعنی ان جنوں میں سے جو اپنے آقا کے فرماں بردار ہیں وہ سیدھے رستے پر چلے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ (انّ اللہ ربّی و ربّکم فاعبدوہ ھذا صراطٍ مستقیم ہ) یعنی عبودیت رب کرنا ہی صراط مستقیم یا راہ رشد و ہدایت ہے جس کا لازمی نتیجہ فلاح دارین ہے اور نافرمانی کا نتیجہ جہنم ہے واما القاسطون فکانوا لجہنم حطباً) نافرمان جنات جہنم کے کندے بنیں گے۔

غرضکہ سورۃ الجن سے بھی صاف روشن ہے کہ معشر الجن بھی اپنے اعمال کے جوابدہ ہوں گے اس سے ثابت ہے کہ وہ اپنے اعمال میں مثل انسانوں کے مختار ہیں اس سورہ کے بعد ہی سورۃ الحمد کی وہ آیتیں نازل ہوئی ہیں لہٰذا

اگر سورۂ جن اور اس سے پہلے شعب ابی طالب کا قرآن خصوصاً سورۂ یوسف پڑھ لی جائیں تو پھر سورۃ الحمد کو قرآن سے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

عالمین کہ عالمیَن سورۃ الجن میں ثقلین کے لفظ اور سورۂ رحمان میں معشر الانس والجن سے بار بار تخاطب کو ذہن میں رکھئے کہ سوائے جن اور انس کے کوئی مخلوق مکلف نہیں ہے۔ لہٰذا علمائے نحو کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ رب العالمین میں حجاج ابن یوسف کے حکم سے میم پر کہیں غلطی سے کسرہ تو نہیں دے دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمین کو عالم کی جمع سمجھ کر ہیشر دہ ہزار عالم کو قرآن کا مخاطب ماننا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ذوی العقول اور وہ بھی مختار مخلوق کے علاوہ قرآن عالم ناسوت سے متعلق ہے نہ عالم ملکوت ولاہوت وجبروت سے۔ اس کا تعلق صرف ان سے ہے جنھیں آخرت میں ان کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی۔ ہماری رائے میں دو جن وانس ہیں اور یہ لفظ عالمیَن بفتحہ میم بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ نحویوں نے اس بات کو بھی ایک قاعدہ کلیہ تسلیم کر لیا ہے کہ اگر تثنیہ کا استعمال صرف دو تک محدود نہ ہو تو اس کو مجموع کی شکل میں استعمال کر سکتے ہیں لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اصل میں عالمیَن تثنیہ ہے اور صرف جن و انس کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن صرف دو عالموں تک محدود رکھنے کے لئے جمع کی شکل میں "عالمین" کہا گیا ہے۔

اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عالم انسانی کے اندر کئی عالم ہوں کوئی اچھے انسانوں کا گروہ ہو۔ کوئی بُرے انسانوں کا، کوئی مالداروں اور شاہوں کا کوئی مفلسوں اور غلاموں کا۔ اس طرح عالم انسانی کے

ہر ایک گروہ کو عالم مانا جائے تو بھی یہ صرف ذوی العقول کے لئے ہے اسی لئے کہا گیا کہ: ھٰذا بصائرُ لِلناسِ وھُدی ورحمۃ لقومٍ یوقنون ہ یعنی یہ قرآن انسانوں کے لئے ہے

مفہوم سورۃ الحمد

پس منظر اسلام اور ترتیب نزول کی روشنی میں سورۃ الحمد کے الفاظ کی تحقیق

مخاطبین قرآن قرآن کا تخاطب مختلف زمانوں میں مختلف خیال کے لوگوں یا قوموں سے ہے۔ قرآن کا مقصد اصلاح انسانی بذریعہ الطلاء عقائد باطلہ ہے۔ سورۃ الحمد کی پہلی دو آیتوں کے مخاطب مشرکین مکہ اور مشرکین عرب ہیں اور آخری آیت میں مغضوب علیہم اور ضالین سے مدینہ میں خطاب کیا گیا ہے اور پھر ان تینوں آیتوں کا مخاطب ہر انسان کو بنا کر اسے انسانوں کے لئے ایک دعا بنا دیا ہے۔

الحمد: پس منظر کسی کی تعریف کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو بے غرضی سے کی جاتی ہے اور دوسری غرض سے ہوتی ہے مثلاً آپ کسی پھول، یا شعر یا عمارت کے حسن سے متاثر ہو کر اس کی خوبیاں بیان کرنے لگیں اور اس کے بنانے والے کے کمال کو سراہیں تو یہ بے غرض تعریف ہوگی جو آپ کے دل سے نکلی ہوئی ہوگی۔ دوسری تعریف خوشامدانہ اور غرضمندانہ ہوتی ہے مثلاً کسی بادشاہ، حاکم، یا افسر کی تعریف کہ آپ ہفت اقلیم کے مالک ہیں اور ایسے عادل ہیں کہ نوشیرواں بھی آپ کے سامنے ہیچ ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کی جھوٹی تعریفیں کسی ذاتی منفعت کے لئے کی جاتی ہیں

اسی ضمن میں وہ سب طریقے بھی داخل ہیں جو پروہتوں اور کاہنوں نے دیوتاؤں یا دیویوں کو خوش کرنے کے لئے ایجاد کر لئے ہیں۔ مقصد ان کا صرف یہ ہے کہ لوگ بے وقوفی سے اپنی دولت دیوتاؤں کے نام پر دیں اور وہ خود مزے کریں۔ پھر دیوتاؤں کی بھی قسمیں ہیں۔ بعض نیک ہیں بعض شریر لیکن دونوں کو خوش رکھنے کے لئے اور بروں کے شر سے بچنے کے لئے وہی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جو امرا یا سلاطین کو خوش کرنے کے ہوتے ہیں۔ کوئی نذرانوں سے خوش ہوتا ہے، کوئی کنواری لڑکیوں سے لطف اٹھانا چاہتا ہے یا ناچ گانا پسند کرتا ہے۔ قربانی کا خون جسے جوہر حیات سمجھا جاتا ہے وہ بھی دیوتاؤں کی پسندیدہ غذا ہوتی ہے۔ کسی نے دیوتاؤں کو زیادہ خوش کرنا چاہا تو وہ اپنے لڑکے کو ہی قربان کر دیتا ہے اور جو یہ نہیں کر سکتا وہ دیوتاؤں کے مندروں کے گرد پھر کر (طواف یا پری کرما) سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں اپنی جان دیوتا کے لئے تصدق کرنے کو تیار ہوں۔ بہت سے جنگلی قبائل میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ دیوی یا دیوتا کے نام پہ اپنے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر پیش کر دیتا ہے حتیٰ کہ زبان تک کاٹ کر پیش کرنا معمولی بات سمجھتا ہے بعض لوگوں کی تحقیق ہے کہ سامی اقوام میں ختنہ کی رسم اسی زمانے کی یادگار ہے جب کہ انسان اپنے جسم کا ایک حصہ دیوتا پر چڑھا دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر اور آسان کیا طریقہ ہو سکتا تھا کہ فاضل کھال کا حصہ دیوتا کو پیش کر دیا جائے۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

آنحضرت نے قرآن کے ذریعہ تعریفوں، اور شکر گزاریوں کے ان سب طریقوں کو منسوخ کر دیا بلکہ دیوتاؤں ہی کا خاتمہ کر کے صرف ایک اللہ کی طرف متوجہ کر دیا وہ الالہ (اللہ) چونکہ خود ہی ہر چیز کا خالق اور معطی ہے

اُسے نہ خون و گوشت کی ضرورت ہے کہ اپنا پیٹ بھرے۔ نہ اس کی ضرورت ہے کہ کنواری لڑکیاں اُسے گانا سنائیں یا پروہتوں کی جورو بنیں اور خدا کی جورو کہلائیں۔ البتہ آنحضرتؐ نے ایک طریقہ باقی رکھا کہ لوگ طواف کعبہ کر کے یہ ظاہر کریں کہ ہم خدا کے غلام ہیں اور اس کے اشارے پر اپنی جانیں دینے کو تیار ہیں اس لئے کہ دینے والا وہی ہے۔ بے مانگے دیتا ہے۔ اُس کی غلامی میں خود غلام کا فائدہ ہے رب کا نہیں ہے۔ غلاموں کی طرح اس کے قانون پر چلنا یعنی بے چون و چرا اپنی مرضی کو رضائے الٰہی کا پابند کر لینا ہی غلام کے لئے فوز عظیم ہے۔

لفظ الحمد اور ترتیب نزول

یُسبّح للہ ما فی السماوات وما فی الارضِ لہُ الملک ولہُ الحمد

(یعنی بادشاہت اور حمد صرف اسی کے لئے ہے) (التغابن)

(۱) وسبّح بحمدِ ربّک حین تقوم (الطور) (یعنی اپنے آقا کی حمد بولا کرو)

(۲) وسبّح بحمد ربّک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب

(۳) والملائکۃ یُسبّحون بحمدِ ربّھم (الشوریٰ)

(۴) ھو الحیُّ لا الٰہَ اِلّا ھو فادعوہُ مخلصین لہ الدین۔ الحمدُ للہ ربّ العالمین ۰ (المؤمن) یعنی زندہ خدا کے علاوہ (مردہ (بتوں وغیرہ) کو مدد کے لئے نہ پکارو)

حمد یعنی مدد کے لئے پکارنا اور اظہار شکر کرنا صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمد کے معنی استعانت کے ہیں۔ اسی سورہ میں ہے (فاصبر ان وعد اللہ حقٌّ واستغفر لذنبک وسبّح بحمدِ ربّک بالعشی والابکار (یعنی صبر کرنا ادب کو مدد کے لئے پکارنا ہی تسبیح حمد رب ہے

الذین یحملون العرش ومن حولہٗ یسبحون بحمدِ ربہم ٥ (المومن)
یعنی فرشتے بھی حمد کرتے ہیں۔

(۵) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہٗ و اورثنا الارض (الزمر)
وتری الملائکۃ یسبحون بحمد ربہم ...... وقیل الحمد للہ
رب العالمین (آخر آیت الزمر)

(۶) فللہ الحمد رب السماوات و رب الارض رب العالمین (الجاثیہ)

(۷) یسبح للہ ما فی السماوات وما فی الارض لہ الملک و لہ الحمد۔
یعنی بادشاہت اور حمد صرف اسی کے لئے ہے (التغابن)

حمد کا طریقہ مندرجہ بالا آیتوں سے ظاہر ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ فرشتے بھی خدا کی شکر گذاری یعنی اس کے احسانات کے اعتراف کے لئے مکلف ہیں لیکن انسان وجن کے لئے ربّ کے احسانات کا اعتراف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اسی کو آقا مان کر اس کے ہر حکم کی تعمیل خود اپنے بھلے کے لئے کی جائے اور مخلص ہو کر کی جائے۔ یعنی سوائے اللہ کے غیر اللہ کی مدد کا تصور بھی دل میں نہ لایا جائے۔ پھر اس زندہ خدا کی مدد کا استقامت سے یقین بھی رکھے۔ معمولی مشکلات سے گھبرا کر تشکیک میں نہ پڑے۔ اسی لئے فرمایا: ان الذین قالوا ربنا اللہ (یعنی سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہ مانے) ثم استقاموا (پھر اس عزم پر ثبات اختیار کرے تو) فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون ٥۔

اسی طرح اکثر جگہ خدا سے مدد مانگنے کا یہی طریقہ بتایا کہ اس کے حکموں پر خوش دل غلاموں کی طرح چلو اور صبر و صلوٰۃ کے ساتھ اس کی نصرت کا یقین رکھو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح عزم و ثبات سے حمد کرنے والوں

کے سامنے پہاڑ بھی آجائیں، تو وہ گرد ہو کر اُڑ جائیں گے۔

اللہ: پس منظر مختلف قوموں میں خدا کا تصور پیدا ہو چکا تھا عربی زبان میں جس چیز کی پرستش کی جائے اُسے معبود یا الٰہ کہتے ہیں۔ الاہوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ اربعہ عناصر کی مختلف صورتوں اور جمادات، حیوانات، نباتات کی مختلف کیفیتوں کی پرستش ہوتی تھی یعنی پروہت، یہ بتاتے تھے کہ ان کو خوش کر کے کس طرح اپنی مرادیں اور خواہشیں پوری کر سکتے ہو۔ بعض قوموں میں خود پروہت الٰہ یا دیوتا بن گئے تھے۔ ایک عام دیوتا شیطان یا نفس امارہ بھی تھا۔ یا بالفاظ دیگر انسانی خواہش کی پوجا عام تھی۔ اس کی پرستش آج کل بھی زوروں پر ہے قرآن نے اسی کو کہا ہے کہ لوگوں نے اپنے ہوائے نفسانی کو معبود (الٰہ) بنا لیا ہے اور وہ جو کہتا ہے اُسی پر بے چون وچرا غلاموں کی طرح عمل کرتے ہیں (من اتخذ الٰہہ ھواہ)

ال الٰہ ہندوؤں، یہودیوں، اور عربوں میں ایک سب سے بڑے دیوتا (ال الٰہ) کا تصور بھی پیدا ہو گیا تھا جسے وہ دیوتاؤں کا بادشاہ یا شہنشاہِ خدایان سمجھتے تھے یہ اللہ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی موجود تھا کہ وہ کل کائنات کا الٰہ (معبود) ہو یا نہ ہو لیکن وہ ہماری قوم کا مخصوص الٰہ ضرور ہے اور دوسری قوموں کے الاہوں یا دیوتاؤں سے زیادہ طاقتور ہے۔

قرآن نے اس تصور کو مٹا دیا اور بتایا کہ ال الٰہ کے سوا اور کوئی الاہ نہیں ہے۔ وہ سب قوموں کا الاہ ہے۔ وہ مادی شکل نہیں رکھتا۔ نہ بار بار مر کے زندہ ہوتا ہے (جیسا کہ مصریوں کا تصور تھا) بلکہ وہ حی و قیوم ہے،

اور ایک ہی ہے۔ البتہ مختلف قوموں میں اس کے مختلف نام ہیں لہٰذا سب سے اچھے نام کو قبول کرلو۔ نصرانی اسے رحمانان کہتے ہیں۔ ایرانی خدا کہتے ہیں۔ ہندو پرماتما کہتے ہیں۔ غرضکہ کوئی ایک نام اس کا نہیں۔ بلکہ

آنکہ او نامے ندارد ـــ بہر نامے کہ خواہی سر بر آرد

نام متعدد ہیں لیکن اس کی ذات ایک ہی ہے۔ اسی طرح شعوب و قبائل تو مختلف ہیں لیکن اللہ کے مخلوق اور اس کے بندے ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ ایک ہی آقا کے سب غلام ہیں۔

وہ کیا ہے؟

ہر قوم خدا کا ایک تصور رکھتی تھی۔ وہ حیرت میں نہ تھی کہ وہ کیا ہے۔ اس لئے اللہ کو ہم ولہ سے مشتق نہیں سمجھتے قرآن کا صرف یہ کہنا ہے کہ ان الاہوں کو جن کے تم غلام بنے ہوئے ہو (جن میں ہوائے نفس بھی داخل ہے) ترک کردو اور اس الہٰ سے مدد مانگو اور اس کی غلامی کا اعلان کرو، جو واقعی مدد بھی دے سکتا ہے اور جس کی غلامی میں سراسر تمہارا فائدہ ہے اس کا فائدہ نہیں ہے۔ وہ نہ نذرانے مانگتا ہے نہ گانا سننا چاہتا ہے نہ خون سے خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو خود نہایت ہی کریم آقا و خالق ہے۔ وہ کیوں اپنی مخلوق کو دکھ دینے لگا

اللہ اور ترتیب نزول

قرآن میں ابتدائی سورتوں میں صرف "رب" کا ذکر ہے۔ اس دور کے بعد ایک پورے دور میں الٰہ کا نام آتا ہے اور اسی دور میں الٰہ کے ساتھ ساتھ اللہ بھی آتا ہے۔ گویا انسان کو اللہ کے ساتھ مانوس کرنے اور اس کے صحیح تصور کو قائم کرنے کے لئے پہلے "رب" کے تصور کو اور اس کے بعد الٰہ (معبود) کے تصور کو روشناس کرایا گیا ہے۔ یکایک اللہ یا رحمان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

رب: پس منظر ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ دنیا میں ہر طرح کی ذہنی و جسمانی غلامی پھیلی ہوئی تھی اور آزاد بھی اپنے ہوائے نفس یا پروہت و ساحر کے فریبوں کا شکار تھے۔ فرعون بھی رب بنا ہوا تھا۔ مذہبی پروہت اور حبر بھی ربّی کہلاتے تھے اور ہر ایک غلام ساز رب کہلاتا تھا۔

رب اور عبد آقا، خواجہ، مالک، صاحب وغیرہ کے لئے عربی میں رَب کا لفظ رائج تھا۔ اس کے مقابلے میں مملوک یا عبد کا لفظ غلام یا بندہ یا داس کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اسی لئے سورۂ الحمد میں رب (یعنی آقا) کی مناسبت سے نَعۡبُدُ (یعنی غلامی) کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ اللہ کیا حسنِ بیان ہے۔

رب یا آقا دو قسم کے ہوتے تھے یعنی ظالم اور کم ظالم۔ کوئی آقا جب تک وہ اپنے غلام سے خواجگی کا تعلق رکھتا ہو کسی صورت سے کریم و رحیم نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اگر آپ کسی غلام سے پوچھیں کہ تمہارا آقا کیسا ہے تو وہ ہمیشہ یہی کہے گا کہ وہ ظالم ہے یا دوسرے کے مقابلے میں کم ظالم ہے۔ وہ کسی صورت سے یہ تسلیم نہ کرے گا کہ میرا آقا کریم ہے یا پرورش کنندہ ہے۔ وہ اگر پرورش کرتا بھی ہے تو اپنی غرض کے لئے کرتا ہے۔ لیکن خدا ایسا رب ہے جو بندے کو اسی کے نفع کے لئے دیتا ہے۔ بہرحال وہ اپنے آقا کے مُنہ پر جھوٹی خوشامد کے طور پر اسے اپنا پروردگار، پالنے والا، مہربان، ان داتا، سرکار، غریب پرور، اور نہ جانے کیا کیا کہے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دل ہی دل میں اُسے کوستا بھی جائے گا کہ یہ بدمعاش ان داتا وہی ہے جس نے کل رات کو بردباری

کے دوران میں مجھے ننگے پاؤں میلوں دوڑایا تھا یا میری محبوبہ کو کوڑوں سے مار مار کر گھائل کر دیا تھا یا اس کے اکلوتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر بیچ آیا تھا۔

ان غلاموں کے دکھی دل کی پکار صرف ایک شخص نے سنی وہ رسول عربی تھے۔ انھوں نے غلاموں کے ارباب من دون اللہ سے بغاوت پر آمادہ کر دیا اور دنیا میں غلامی کے مٹنے کا سب سے پہلا قانون نافذ کیا۔ اور پہلی ہی وحی سے آخر دعوت (یعنی حجۃ الوداع تک) انسانیت کے اس ناسور کو مندمل کرنے کی دوائیں بتائیں اور سلطنت قائم کرنے کے بعد اسے مٹا کر چھوڑا۔ اسی لئے ہم سمجھتے ہیں کہ رَبّ کے صرف وہی معنی لئے جائیں جو رسول اللہ کے مخاطب سمجھتے تھے یعنی آقا۔ نہ کہ پالنے والا یا پروردگار۔ ان ربوں میں سے کوئی پروردگار نہ تھا۔ پروردگار صرف ایک رب ہے جس نے پیدا کیا ہے۔ باقی جتنے رب تھے یا ہیں وہ سب خود غرض اور پاجی تھے اور ہیں۔

رب اور ترتیب نزول

وحی اوّل کے بعد قرآن میں پورا ایک دور ہے۔ جس میں خدا کے لئے رب کے تصور سے ابتدا کی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے اسماء مثل الٰہ و اللہ کے استعمال ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ تصور پہلی وحی میں ربک الذی خلق سے دیا گیا ہے (العلق) پھر اسے الاکرم کہا ہے اس کے بعد الاعلیٰ العظیم وغیرہ صفات سے موصوف کیا ہے۔

(۴) العالمین: پس منظر

قرآن کا روئے سخن انسانوں کی طرف تھا۔ یہ انسان دوسرے انسانوں کو غلام بنایا کرتے تھے۔ اس لئے بار بار یہ کہا گیا کہ اللہ ہی کل انسانوں کا آقا (رب) ہے۔ اور جو لوگ ارباب من دون اللہ (اللہ کے سوا دوسرے آقاؤں) کو اپنا رب یا آقا مانتے ہیں وہ دھوکے میں ہیں اس لئے کہ اللہ نہ صرف زمین و آسمان اور کل کائنات کا آقا ہے بلکہ ان کا بھی آقا ہے جو دوسرے لوگوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں مثلاً امیہ بن خلف اور ابوجہل قسم کے لوگ، یا وہ پروہت و ساحر جو جبول اور شیطانوں کو ارباب (آقا) مانتے ہیں۔ ان سب کا بھی آقا (رب الارباب) اللہ ہے۔

مقصد یہ تھا کہ لوگ مساوات انسانی کو قائم کریں اور دنیا سے بتوں کی، پروہتوں کی اور انسانوں کی خواجگی کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔ گویا کہ جو انسان غلامی میں پھنسے ہوئے تھے ان کے لئے قرآنی تعلیم یہ تھی کہ ارباب من دون اللہ سے بغاوت کر دو اور صرف اس آقا کے غلام بن جاؤ جو عالمین کا آقا (رب) ہے۔

عالمین کے قرآنی معنی

ترتیب نزول کے مطابق قرآن پڑھئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ عالمین انسانوں یا لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن حیوانات و نباتات کی اصلاح کے لئے نہیں ہے، کہ اس میں ہیژدہ ہزار عالم شامل کر لئے جائیں مثلاً

① ان اللہ غنی عن العالمین (عنکبوت ۲۹ - آل عمران) اللہ سب لوگوں سے بے نیاز ہے

② اولیس اللہ باعلم بما فی صدور العالمین (عنکبوت) کیا اللہ نہیں جانتا

کہ انسانوں (یا مجنوں) کے دلوں میں کیا باتیں ہیں)

(۳) فانجیناہُ واصحابَ السفینۃِ وجعلنٰھا آیۃً للعالمین (عنکبوت ۱۵)
ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو نجات دے کر انسانوں کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا)

(۴) اِن ھوَ ذکرٌ للعالمین (تطفیف ۲۷) یہ عالمین (جن و انس) کے لئے نصیحت ہے)

(۵) اولم ننھک عن العالمین (۱۵-۷۰) کیا ہم نے تجھے عالمین (لوگوں) سے نہیں روکا

(۶) سلامٌ علیٰ نوحٍ فی العالمین (والصافات ۷۹) عالمین (انسانوں) میں سے نوح پر سلام ہو

(۷) فضّلنا علی العالمین (۶:۸۶) ہم نے انسانوں (عالمین) پر فضیلت دی

(۸) اَتاتون الذکران من العالمین (شعراء ۱۶۵) کیا تم مردوں سے بدفعلی کرتے ہو؟

(۹) وھوَ فضّلکم علی العالمین (۷:۱۴۰) اس نے تمھیں انسانوں پر فضیلت دی

(۱۰) وما اللّٰہُ یریدُ ظلماً للعالمین (آل عمران ۱۰۸) اللہ انسانوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا

(۱۱) انّ فی ذالک لآیاتٍ للعالمین (روم) اس میں عالمین (جن و انس) کے لئے نصیحت ہے

(۱۲) واٰتاکُم ما لم یوتِ احداً من العالمین (مائدہ) کسی کو انسانوں یا جنات میں سے

(۱۳) فانی اُعذبہ عذاباً لا اعذبہ احداً من العالمین (مائدہ)
میں ایسا عذاب دوں گا کہ کسی شخص کو عالمین میں سے نہیں دیا گیا

(۱۴) جب حضرات ہارون و موسیٰ فرعون کے پاس گئے اور کہا کہ انا رسول رب العالمین (شعراء ۱۶) تو چونکہ خود فرعون اپنے آپ کو رب الناس سمجھتا تھا اس نے پوچھا کہ رب العالمین کون ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ زمین و آسمان کا رب ہی انسانوں کا آقا ہے جس میں تو بھی شامل ہے
قالَ فرعونُ وما ربُّ العالمین ٥ قال ربُّ السمٰوٰت والارض وما بینھما ان کنتم موقنین - قال ربکم وربُّ اٰبائکم الاولین (الشعراء ۲۴)
(فرعون نے پوچھا کہ عالمین (جن و انس) کا آقا کون ہے - جواب ملا وہ رب (آقا) جو زمین و آسمان اور تمھارے اور گزشتہ انسانوں کا رب (آقا) ہے

ان آیات سے روشن ہے کہ رب کے معنی آقا اور عالمین کے معنی انسان کے ہیں۔ پہلی وحی بھی یہی کہتی ہے کہ رب نے انسان کو علق سے پیدا کیا ہے وہی اصلی آقا ہے جو خالق ہے دوسرے آقا مصنوعی ہیں، ہیچ ہیں، اُن سے بغاوت کر دو اور ہر نماز میں تجدید پیمان انقلاب کرتے رہو۔

عالمین صیغۂ تثنیہ اہل لغت کہتے ہیں، کہ عالم اسم جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے اور عالم کی جمع عالمون اور عوالم آتی ہے اور اس پر کسی کی توجہ نہیں گئی کہ اس کا تثنیہ بھی عالمان ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ رحمان اور سورۂ جن دیکھئے۔

ایک مسئلہ اہل لغت و نحو کی توجہ کے لئے ایک یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے، کہ قرآن کی کتابت کے وقت اس کے حروف نقطوں اور اعراب سے خالی تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عالمین، درحقیقت عالمی (یعنی انسان) کی جمع ہو اور عالمیین بولا جاتا ہو۔ تحریر میں عالمین لکھا گیا ہو اور جب حجاج بن یوسف کے زمانہ میں نقطے لگائے گئے تو عالمیین کا عالمین رہ گیا ہو۔

(۵) الرحمان: پس منظر لوگوں نے بہت سے قومی دیوتا یا خدا بنا لئے تھے۔ عالمگیر خدا کا تصور کہیں نہیں تھا۔ ہر قوم اپنا مخصوص خدا رکھتی تھی اور اسے دوسری قوموں کے خداؤں سے زیادہ طاقتور سمجھتی تھی۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔

لیکن نصرانیوں میں خصوصاً یمن و حبشہ میں ایک کل قومی معبود کا تصور موجود تھا۔ وہ اپنے خدا کو کل قوموں کا خدا مانتے تھے اور اسے رحمانان کہتے تھے۔ عربوں میں بھی ایک بڑے خدا کا تصور موجود

تھا جیسے وہ الٰ الہ (اللہ) کہتے تھے اور جب کوئی چھوٹا دیوتا یا دیوی ان کے پاس نہ ہوتا تو اس بڑے اللہ سے مدد مانگ لیتے تھے۔ مثلاً سمندر وغیرہ میں اللہ ہی کو اپنا مددگار سمجھتے تھے۔ مجوس میں دو خداؤں کا تصور پیدا ہو گیا تھا۔ ایک کو خدائے خیر (اہورامزدا) اور دوسرے کو اہرمن (خدائے شر) سمجھتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اس دنیا میں خدائے شر کی سلطنت ہے۔ عالم بالا میں ہرمز حکمراں ہے یہ دونوں کل عالمی خدا مانے جاتے تھے۔

قرآن نے ایک اچھے عالمگیر خدا کا تصور پیدا کیا اور چونکہ ہجرت حبشہ سے پہلے اہل حبشہ سے دوستی مقصود تھی لہٰذا اُس زمانے میں قرآن نے بکثرت رحمان کا لفظ اللہ کے لئے استعمال کیا۔ جب پہلی دفعہ حضرت ابن مسعود سے قریش نے یہ سُنا کہ "الرحمٰن علم القرآن" تو انھوں نے استہزاء شروع کر دیا کہ یمامہ میں ایک شخص رحمان نامی رہتا ہے جو آنحضرت کو قرآن سکھاتا ہے۔ بہر حال حضرت ابن مسعود نے قرآن بالجہر پڑھنے اور رحمان کا نام لینے پر خوب مار کھائی لیکن پڑھنے سے باز نہ آئے۔ اس کے بعد کفار کہنے لگے کہ کیا خوب جب کسی غیر قومی دیوتا کو آپؐ کہیں کہ خدا مان لو۔ کیا ہم مان لیں! ہم نہیں جانتے کہ رحمان کون ہے (قالو! ما الرحمان) تو قرآن نے جواب دیا ھم یکفرون بالرحمان قل ھو ربی (الرعد) اور کہا کہ (اذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالو! ما الرحمان؟ انسجد لما تامرنا و زادھم نفورا ۵ (الفرقان ۵) اسی زمانہ میں سورۂ مریم نازل ہوئی اور نصرانیوں نے خدا کو جو نام رحمانان دے رکھا تھا اسی کو قرآن نے بار بار دہرایا۔ غرضکہ قریش پر صاف ثابت ہو گیا کہ آنحضرتؐ اور

مسلمان ان نصرانیانِ حبشہ سے دوستی کر رہے ہیں جنھوں نے عام الفیل میں کعبہ ہی ڈھا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اور زیادہ رحمان کے نام سے نفرت اور اسے عربی لفظ تسلیم کرنے سے انکار کرنے لگے۔

غزوۂ بدر میں امیہ بن خلف نے حضرت عبد الرحمان بن عوف کو عبد الرحمان نہ کہا باوجودیکہ شکست کے بعد وہ موت کے منہ میں تھا اس لئے کہ وہ کہتا تھا کہ قریش رحمان کو نہیں جانتے۔ البتہ انہیں مجبوراً عبد اللہ کہہ کر پکارا اور جان بچانے کی کوشش کی (ابن ہشام۔ غزوۂ بدر) قریش نے صلحنامہ حدیبیہ میں بھی الرحمان سے نفرت کا مظاہرہ کیا خود آنحضرتؐ نے الرحمان مٹا کر صرف بسمک اللھم لکھوایا۔ (ابن سعد۔ ابن ہشام صلح حدیبیہ) بدر۔ احد۔ فتح مکہ اور حنین میں مسلمانوں کا جنگی نعرہ بھی یا رحمان تھا۔ گویا ایک طرف رحمان پرست تھے اور دوسری طرف شیطان پرست ایک طرف ایک عالمگیر خدا کے ماننے والے تھے خواہ اس کا مختلف قوموں میں کوئی نام ہو۔ دوسری طرف صرف تفاخر، نسب کے حامی تھے کہ صرف اپنے قومی خدا یا خداؤں کے پوجنے والے تھے۔ جو مساوات و توحید انسانی کے دشمن کی حیثیت سے رحمان پرستوں کو یعنی خدا کے عالمگیر تصور کو قائم کرنے والوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

رحمان اور لغت عربی کلام جاہلیہ میں رحمان کا لفظ نہیں پایا جاتا۔ لسان العرب میں صرف ایک شعر ہے جس میں رحمان کا لفظ ہے اس کے معجمہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خود قریش اس کو عربی ماننے سے انکار کرتے تھے حالانکہ رحیم یا کسی اور

صفتِ الٰہیہ پر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رحم سے مشتق نہیں ہے۔ عبرانی، حبشی و یمنی زبانوں میں یہ لفظ رائج تھا۔ یمن کے کتبوں سے بھی رحمانان کرستوس اور مریم کے نام ثابت ہیں۔

رحمان کیوں؟ بہرحال یہ عجمی لفظ تھا اور آنحضرت چاہتے تھے کہ جس ذات (یعنی اللہ) کے لیے رحمان یا دوسرے اسمائے مختلف قوموں میں رائج ہیں ان سب کو اہل عرب تسلیم کر لیں کہ وہ ایک عالمگیر خدا (اللہ) کے نام ہیں۔ اور وہ مان لیں کہ سب اس ایک رب کے عبد ہیں جس نے کل دنیا اور کل انسانوں کو خلق کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس انٹرنیشنل تصور کو زیادہ نمایاں کرنے کی جگہ لوگوں نے اس کا ترجمہ کر کے وحدت ادیانِ الٰہیہ کے شاندار تصور کو ادنیٰ درجہ دے دیا۔ اگر ترتیب نزول قرآن اور سیرت نبوی میں "رحمان" کے لفظ کی تاریخ پر نظر رکھی جاتی تو صاف ظاہر ہو جاتا کہ رحمان کیوں استعمال ہوا۔

رحمان اسم علم ہے جس طرح اسم اللہ اسم علم ہے۔ اسم صفت نہیں ہے اسی طرح رحمان بھی اسم علم ہے یعنی اللہ کا ایک نام ہے جو غیر اللہ کے لئے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ایسی حدیث نبوی بھی ہے (وللہ الاسماءُ الحسنیٰ فادعوہُ بھا وذروا الذین یلحدونَ فی اسمائہٖ) (الاعراف)

(۶) ملک: پس منظر دنیا میں یہ تصور عام تھا کہ بادشاہ یا قبیلے کا سردار جسے ہندی میں چودھری کہتے ہیں وہ قوم یا قبیلہ کا نہ صرف جرنیل ہوتا تھا بلکہ لوگوں کے جھگڑے قضیئے چکانے کی آخری عدالت بھی ہوتا تھا اس لئے جنگ کی حالت میں

ہر قوم یا قبیلہ کا مخصوص جنگی دیوتا بھی جنگ میں شریک رکھا جاتا تھا بلکہ جو سلطنتیں یا قبیلے جنگ میں شریک ہوتی تھیں وہ یہی سمجھتی تھیں کہ شکست و فتح ان دیوتاؤں یا خداؤں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم ہار جاتی تھی تو اس لئے نہیں کہ وہ کمزور ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کا دیوتا (بعل ھیل یا ملک) اس قوم کی بدکرداریوں سے ناراض ہے۔ یہی تصور یہودیوں میں تھا اور ان کا مخصوص خدا یہوا دوسری قوموں کے مقابلہ میں لڑا کرتا تھا لیکن جب وہ بنو اسرائیل سے خفا ہو جاتا تھا تو انھیں قتل کروا دیتا تھا۔ غرضکہ اصلی بادشاہ، جرنیل اور قاضی خدا اور قومی دیوتاؤں کو مانا جاتا تھا۔ دنیوی بادشاہ یا قبیلہ کا چودھری قومی خدا یا خداؤں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ فرعون مصر، عزیرس کا۔ حمورابی بعل کا۔ اسرائیلی بادشاہ یہوا کا اور اسی طرح ہر ایک مذہبی یعنی روحانی سلطنت میں بادشاہ یا رئیس کسی نہ کسی دیوتا کا مظہر یا اوتار یا نمائندہ سمجھا جاتا تھا

حضرت امام مالک کی قرات بھی ملک ہے مالک

مَلِک اور مالک نہیں ہے۔ لیکن بعض مفسروں نے اس لفظ کو مالک بھی بتایا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ رسم الخط کے اعتبار سے یہ مَلِک ہے اور میم پر الف کا اضافہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ہوا ہے۔

یہ بھی خیال ہے کہ ملک کے مقابلے میں مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا کلی اختیار ہوتا ہے۔ یعنی اگر خدا کو مالک مانا جائے تو وہ اختیار رکھتا ہے کہ جسے چاہے جنت میں بھیج دے جسے چاہے جہنم میں داخل کر دے۔ لیکن اگر خدا کو ملک یا قاضی مانا جائے تو وہ کسی قانون کے ماتحت ہی فیصلہ کر سکے گا۔ گویا خدا کو بھی کسی قانون سے مجبور اور اس کا پابند

ہونا پڑے گا لعد یہ اس کی شان کے منافی ہے۔ یعنی مالک ہونا مختار مطلق ہونا ہے اور ملک ہونا کسی قانون کا پابند بن کر مجبور ہو جانا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے بھی بہت سی لایعنی بحثیں قدرت الٰہیہ و امکانِ کذب وغیرہ کے متعلق ہو چکی ہیں لیکن وہ سب عدم ترتیب مرتل سے قرآن پڑھنے کا نتیجہ ہیں قرآن میں قانون عدلِ الٰہی پر یوم الدین کے سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا ہے وہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ یوم الفصل یا یوم الدین میں عدل کیا جائے گا گویا خدا خود اپنے قانون کے مطابق فیصلہ میں عدل کو ملحوظ رکھے گا۔ بہ الفاظ دیگر وہ مطلق العنان مالکوں کی طرح فیصلہ کرنے میں ظلم کو راہ نہ دے گا۔ وَمَا اللّٰہُ ظَلَّامٍ لِلعَبِید کے بھی معنیٰ ہیں کہ خدا ہرگز کسی نیکوکار کو جہنم نہ بھیجے گا۔ لیکن چونکہ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے اس لیئے اس کی کمزوریوں کو درگزر بھی کرے گا یہ معافی بھی ایک قانون رحمت کے ماتحت ہو گی، اس لیے کہ خدا نے اپنے اوپر رحم کرنے کا قانون نافذ کر لیا ہے "کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ" سے گنہگاروں کے لئے ایک قانونی امید مغفرت پیدا کر دی گئی اور اس کی کمزوریوں پر خاص ذرہ نوازی کی نظر ڈالی گئی ہے۔ بہر حال اگر خدا بحیثیت قاضی کے مجبور بھی ہے تو اپنے بنائے ہوئے قانون سے مجبور ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ مالک بن کر مطلق العنان ہو جائے یعنی قانون رحمت و عدالت کو چھوڑ کر نیکوکاروں کو جہنم واصل کرنے لگے۔ جو لوگ یہ تفسیر کرتے ہیں وہ ملک کو پہلے مالک بناتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مالک کا درجہ ملک سے اونچا ہے اور مالک ہونے کے بعد عدل و ظلم کی قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں قرآن نے خدا کو کہیں بھی ظالم ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ خدا کی قہرمانی بھی اپنے نافرمان بندوں کے لئے محبت کے پہلو سے خالی نہیں۔ ایک شفیق ماں اپنے بچے کی

تادیب کے لئے بظاہر سخت گیر معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے ۔ آیت ذیل پر مندرجہ بالا رحمت اور قہر الہی کی روشنی میں غور کیجئے تو ملِک اور مالک کا عقدہ بالکل کھل جاتا ہے (ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک ان ربک لذو مغفرۃ و ذو عقاب الیم۔ (حٰم السجدہ ۴۳) اور ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا نے خود اپنے لئے جو قوانین عدل و رحمت بنائے ہیں وہ ان کا پابند ہے (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا)

خدا کو اگر مالک مانا جائے

یوم الدین کا مالک سے کوئی تعلق نہیں

تو وہ ہر وقت ہر جگہ مالک ہے لیکن ملوکیت یعنی قضاءت یعنی لوگوں کے اعمال کا قانونی فیصلہ کرنے اور انکو جزا و سزا دینے کے لئے خدا موجودہ زندگی میں مالک نہیں ہے ۔ البتہ یوم الدین یا یوم الفصل میں وہ ملِک یا قاضی کی شان میں ہوگا ۔ اس دن اسے مالک سمجھنا اور ملِک نہ سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ ہاں وہ موجودہ دنیا میں قاضی یا حاکم نہیں ہے (حاکم بمعنی جج یا فیصلہ کنندہ)

قرآن سے ملِک یوم الدین کا ثبوت

(۱) قل اعوذ برب الناس ملک الناس الٰہ الناس (والناس)

(۲) ما ادراک ما یوم الدین یوم لا تملک نفس لنفس شیئا والامر یومئذ للہ (التطفیف)

(۳) لمن الملک الیوم ۔

(۴) من بیدہ ملکوت کل شیء (مومنون)

(۵) فتعالی اللہ الملک الحق (مومنون) وھو خیر الحاکمین

(۴) الملک = الحاکم = الفصل : وھو خیر الفاصلین۔
وھو احکم الحاکمین۔

(۷) لم یکن لہ شریک فی الملک (بنی اسرائیل)

(۸) للہ ملک السماوات والارض وما فیھن وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر (المائدہ)

ولہ الملک یوم ینفخ فی الصور (الانعام) یعنی جس دن قیامت ہوگی اس دن وہ قاضی ہوگا (آج انسان کو اختیار دے رکھا ہے بعد ازاں قاضی الملک ہی ہے۔)

شاہانہ طرزِ خطاب

قرآن میں جہاں کہیں زور پیدا کرنے یا شان و شوکت سے اپنے بندوں کو مخاطب کیا ہے، اس میں بھی دنیوی بادشاہوں کے طرزِ اظہار کے مطابق اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

(۱) انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔

(۲) انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔

(۳) انا اعطیناک الکوثر۔

اس سے یہ ثابت ہے کہ خدا کی حیثیت ملک یا شہنشاہ کی ہے نہ کہ صرف مالک کی، جو ملک کے مقابلے میں حیثیت بھی ادنیٰ تر رکھتا ہے اس لئے کہ ملک کے ماتحت کئی مالک ہوتے ہیں۔ شہنشاہ ہے لیکن آج وہ فیصلہ یا حکم نہیں کرتا۔ اس کا آخری فیصلہ قیامت پر موقوف ہے آج ظالموں کو ظلم اور مظلوموں کو صبر کا اختیار حاصل ہے اگرچہ وہ قادر ہے کہ جب چاہے تو آج بھی عذاب نازل کر دے اور سب کو ختم یا قتل کر دے

(۷) یوم الدین : پس منظر مختلف اقوام میں موجودہ زندگی ہی کو آخری زندگی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی جس طرح دوسرے حیوانات پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور خاک میں مل جاتے ہیں اسی طرح انسان کو بھی ایک فنا ہو جانے والا وجود سمجھتے تھے۔ یعنی موت کے بعد انسان کا خاتمہ ہو جاتا تھا

موت اور نفس بہت سی قوموں میں یہ تصور تھا کہ موت کے بعد انسان کا نفس کسی جانور یا درخت میں سما جاتا ہے اور باقی رہتا ہے۔ مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ نفس سورج کے مختلف برجوں سے گزر کر آرام و سکون تک پہنچتا ہے لیکن باوجودیکہ بنو اسرائیل مصر میں عرصہ دراز تک غلام رہے لیکن مصنفینِ توراۃ نے مرنے کے بعد کی زندگی توراۃ میں ذکر تک نہیں کیا اور لقائے نفس کا کوئی تصور نہیں دیا۔ بعد میں دو فرقے صدوقی و فریسی اس پر جھگڑتے رہے کہ مرنے کے بعد نفس باقی رہتا ہے یا نہیں۔

نوٹ: قرآن میں نفس بمعنی روح استعمال نہیں ہوا۔ اگرچہ اردو میں جان یا رواں کے لئے روح کا لفظ چل گیا ہے۔ ہم نفس کے لئے فارسی لفظ "رواں" اور روحانیت کے لئے روانیت کا لفظ استعمال کریں گے تاکہ قرآنی اصطلاح سے قریب تر رہیں)

مشرکین مکہ اور مادّیت افسوس ہے کہ ہمارے پاس مکمل کلام جاہلیت موجود نہیں ورنہ قرآن میں قریش کی مادہ پرستی کے جو اشارے ہیں ان پر کافی روشنی پڑ سکتی۔ آنحضرت کی پوری مکی زندگی ان کو یہ سمجھاتے گزر گئی کہ مادّہ اپنے وجود کے لئے

نفس کا محتاج ہے۔ ایک نفس اعظم ہے جو سب کا خالق ہے۔ مرنے کے بعد یہ نہ سمجھو کہ نفس (رواں) باقی نہ رہے گا۔ وہ خالق جس نے نشاۃ اولیٰ دی ہے وہی نشاۃ ثانیہ بھی دے گا اور پچھلی زندگی کا حشر و قیامت کے بعد جواب طلب کرے گا۔ وہ پوچھے گا کہ غلاموں اور عورتوں پر کیوں ظلم کرتے تھے۔ لڑکیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اور لوگوں کو بت پرستی اور نفس پرستی کی تعلیم دے کر کیوں اجرت لیتے تھے۔ مشرکین نہایت بگڑے بلد تھے۔ کوئی بوسیدہ ہڈی دکھا کے کہتا تھا کہ کیا خوب تمہارا خدا اسے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو کیا اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ہم پر (جو اس کے دشمن ہیں) آسمان گرا دے۔ اگر یہ نہیں کر سکتا تو تمہارا گھر ہی سونے سے بھر دے

شیطان اور قریش البتہ ہم شیطان، جن، غول، عفریت وغیرہ کے قصے بیان کرتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ کہانت و سحر کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور لوگوں کی مرادیں دیوی دیوتاؤں اور شیطانوں کے ذریعہ سے پوری کر لیتے ہیں۔ اگر ہم ایسے خدا کو مان لیں جو ہر جگہ موجود ہے تو ہمارا کاروبار بند ہو جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ایک بڑی روح کو مانتے ہیں جسے اللہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر شیطان سے اس کا رشتہ نہ جوڑیں تو بت پرستی کا خاتمہ کر کے ہم اپنی معاش ہی کو ختم کر دیں گے۔ ورنہ کہاں کا اللہ اور کہاں کا شیطان۔ ہمیں دہر پیدا کرتا ہے اور مار ڈالتا ہے

دین قدیم بابلی لفظ ہے۔ اس کے بنیادی معنی "قانون" کے ہیں۔ بابلی قانون حمورابی کا نام بھی دینا فی شترم ہے۔ اوستا میں اسے دینا کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دھرم اور پالی میں دھما۔ اسی کو قرآن نے دین قیم یا صراطِ مستقیم بتایا ہے۔ یعنی قانونِ حیات (مذہب) اور قانونِ مجازات (جزا) دونوں ایک ہی ہیں۔

قرآن اور یوم الدین

قرآن نے یوم الدین کا تصور اس لئے دیا کہ لوگ ظلم سے باز آجائیں اور عاد و ثمود و نوح و موسیٰ کے زمانہ کے قصوں سے بتایا کہ ظلم سے عدم مساوات انسانی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ خود ظالم بھی جہل و عدوان کی وجہ سے بدعمل ہوجاتا ہے اور قوم ذلت (غلامی) میں پھنس جاتی ہے۔ عزت (آزادی و مساوات) حاصل کرنا چاہو تو "ارباب من دون اللہ" کو چھوڑ کر ایک ربّ اکرم پر بھروسہ کرو۔ پھر سب خوف و حزن دور ہوجائے گا اور اس تجارت کی کساد بازاری نہ ہوگی جو تم محض بت پرستی اور غلامی کے بھروسے پر چلا رہے ہو لیکن اگر اس انذار سے نہ مانے تو یقیناً اس دنیا میں ذلیل (یعنی مملوک) اور دوسری دنیا میں جہنمی بنو گے۔

یوم الدین کا تصور عزت و ترقی کا راستہ ہے

وللآخرة خیر لک

مکّا وحی سے یہ بات شروع ہوئی کہ یہ ہرگز نہ سمجھو کہ غیر اللہ کی عبادت اور ظلم کے ذریعے سے فوز کبیر حاصل ہوگا۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالو۔ ہر عمل کا بدلہ ناگزیر ہے۔ کیسی کیسی قومیں ... العاد والی سوء عملی سے تباہ ہو چکی ہیں۔ خدا کی عدالت و رحمت اس کی مقتضی ہے کہ برا کام کرو تو سزا پاؤ اور نیک عملی کرو تو نعیم حاصل کرو۔ یوم الدین کے تصور نے نہ صرف موت کا خوف مومنوں کے دل سے نکال دیا بلکہ آئندہ زندگی کی راحتوں اور نعمتوں کا بھی یقین پیدا کر دیا۔ البتہ ظالم و طاغی یہ نہیں چاہتے کہ پھر پیدا ہوں اور سزا پائیں مومنوں کے لئے یہ تصور عزت و ترقی کا نشان دیتا تھا اور منکروں کے لئے خوف و ذلت کا دروازہ کھولتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ عبد غلام یا بندے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق "رب" یا "آقا" سے ہے جس کا پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ اگر اس سے ہم عبادت مراد لیں تو رب کی نسبت سے عبودیت کے جو زوردار معنی پیدا ہوئے ہیں وہ باقی نہیں رہتے۔ یہاں مراد ہے کہ اصل آقا تو تو ہی ہے۔ سوائے تیرے کسی نمرود و فرعون کی بندگی میں کوئی بھلا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فراعنہ بھی تیرے قوانین کے سامنے مجبور ہیں۔

عبد کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے چون و چرا اپنے آقا کے حکم کو مانتا ہے۔ رات ہو یا دن، جاڑا ہو یا گرمی اُس کی جان جائے یا رہے وہ اپنے آقا کا حکم مجبوراً بجالاتا ہے۔ لیکن اگر آقا "رب کریم" ہو تو اس کے احکام بجالانے میں خود عبد کا فائدہ ہے اس لئے نعبدُ سے بجائے عبادت (پرستش و پوجا) کے عبودیت (غلامی۔ بندگی) مراد ہے۔ اس عبودیت میں عبد ہی کا فائدہ ہے۔

جبر و اختیار یہاں مسئلہ جبر و اختیار بھی حل ہو جاتا ہے۔ عبادت کرنے میں اختیار پایا جاتا ہے لیکن عبودیت میں جبر ہے۔ ظاہر ہے کہ رب کے احکام ماننے میں اختیار کو دخل ہو تو پھر بہت سے کام ادھورے رہ جائیں۔ لیکن اگر ایسا جبر ہو جس میں بندے کو اختیار ہو کہ اپنے بھلے کے لئے کام کرے یا نہ کرے تو وہ جبر بھی اختیار ہو جاتا ہے ؎ کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔

پھر اس نعبدُ میں جمع کے صیغے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں رب الارباب کی بندگی کا انتظام قائم کرنے کے لئے جماعت کی ضرورت ہے صرف ایک شخص کا اعتراف عبودیت کرنا اور جماعت انسانی اُس کی بندگی

کے لئے تیار نہ کرنا خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس نکتہ کے پیش نظر کہ جملہ اہل اللہ یعنی وہ سب جو اللہ کو رب مانتے ہیں یعنی وہ جو (یومنون بما أُنزِلَ إلیکَ وما أُنزِلَ من قبلکَ) پر عمل کرتے ہیں سب مل جائیں۔ اور دنیا میں بندگان ربّ العالمین کی آمریت قائم کرنے کے لئے ایک زندہ سوسائٹی کی تعمیر کریں جس میں ظلم و طغیان ناممکن ہو جائے یعنی مومن قانتین بن کر خوش دلی سے اپنے آقا کی غلامی کرنا چاہیے اور مختار ہوتے ہوئے مجبور بن جانا چاہیئے۔ راہ سلوک میں اسی کو فنا فی اللہ ہونا کہتے ہیں۔ یہی معراج روحانیت ہے ورنہ مادی بندگی اور غلامی پر جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے فرعون و نمرود جیسے سرکش بھی مجبور ہیں اور رعد و آمال میں بے جان چیزیں تک سجدۂ خالق کے لئے یعنی قانونِ قدرت پر چلنے پر مجبور ہیں۔

ایاکَ نستعین غیر اللہ سے مدد مانگنا عزت و شرف انسانی کے خلاف ہے۔ اور اگر ان سے مانگو بھی تو انھیں دینے کا کیا اختیار ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ ہم سب صرف اللہ سے یہ مدد مانگتے ہیں کہ ہم ایک ایسی کتابی جماعت قائم کر سکیں جس میں سب مجبوراً (غلاموں کی طرح) نیک عمل بن جائیں۔ انسانیت کے اس بلند تصور کی روحانیت کو قائم کرنے کے لئے صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ سے استعانت طلب کرنا خدا سے مدد مانگنے کا بہترین طریقہ ہے (استعینوا بالصبرِ والصّلوٰۃ ان اللّٰہ مع الصابرین) اس لئے کہ اس طریقے میں اللہ مدد دیتا ہے۔ شیطان قریب نہیں آسکتا۔

اِھدنا سب انسانوں کو خواہ وہ مومن ہوں یا نہوں ضلالت سے نکال دے۔ صراطِ مستقیم پر ڈال دے۔

الصراط المستقیم: پس منظر

جو قومیں صرف زراعتی اور خانہ نشینی کی زندگی اختیار کر لیتی تھیں ان میں ذہنی و دماغی دونوں قسم کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی تھیں اور چرواہوں کی صحرا نورد قومیں ان پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ قدیم زمانہ کی جنگی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ مصر پر شامی چرواہوں کا حملہ، ہند میں سنٹرل ایشیا کے آریوں کا مسلسل فوجی داخلہ، سمیریہ اور بابل کی بار بار آویزش سب اسی جذبہ کے ماتحت عمل میں آتی رہیں کہ ساکن کاشتکاروں کو متحرک صحرا نورد وخانہ بدوش لوٹتے رہے۔ امن کے زمانہ میں یہی لٹیرے اُن کے مال تجارت کو اپنی فوج کے بل بوتے پر ایک ملک سے دوسرے ملک کو پہنچاتے تھے۔ اس طرح فوجی تاجروں کے ذریعہ قطاع الطرق کا خطرہ کم ہو جاتا تھا اور فوجی سلطنت کا اولین فرض ہوتا تھا کہ راستے محفوظ ہوں سلطنت میں امن ہو تاکہ تجارت چلے اور طالع فتور قوموں کے باشندے کمزوروں کی محنت کو لوٹ لوٹ کر اپنی دوزخ بھریں۔

آج بھی یہی ہو رہا ہے

عرب اور اکثر قومیں، خصوصاً فونیقی، ہندی اور مصری قدیم زمانے کی تجارتی قومیں تھیں۔ تجارت خشکی وتری دونوں راستوں سے ہوتی تھی۔ عرب کے بے آب وگیاہ ریگستان میں سفر کرنا واقعی نمونہ سقر تھا۔ اور ان کے لئے راستہ بھول جانا گویا جیتے جی موت کے منہ میں چلا جانا تھا۔

منزل مقصود یعنی سفر سے نجات اور راحت ونعیم میں داخلے کا ذریعہ صرف راستہ ہوتا تھا۔ وہ رستہ ٹیڑھا ہو یا سیدھا مقصد تو یہ تھا کہ کسی طرح اس سے مسافر نہ بھٹکے۔ بھٹکا اور یقینی موت کے منہ میں گیا۔

جو لوگ سرسبز و شاداب ملکوں کے رہنے والے ہیں وہ اس کا اندازہ ہی نہیں
نہیں کرسکتے کہ عرب کے بیابان میں راستہ بھولنا کتنی خوفناک موت کا
پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اسی لئے قرآن نے مذہب کے لئے وہ لفظ استعمال کیا ہے جس میں
عربوں کے لئے، اور سمجھنے کی کوشش کریں تو غیر ملکوں کے لئے بھی، وہ
بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جو کسی اور لفظ سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی
قرآن نے مذہب کو دین قویم۔ دین القیم۔ صراط مستقیم، دیناً قیماً (ملت
ابراہیم حنیف) کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ ایسا راستہ ہے جو ریگستانِ
زندگی کے خارزار سے انسان کو باوجود برہنہ پائی کے آرام و راحت کے
ساتھ منزل تک پہنچا دیتا ہے اور باوجود زاد راہ نہ ہونے کے ہر منزل پر چشمۂ
آبِ حیات موجود رکھتا ہے کہ تشنہ لبی کی خوفناک موت سے سابقہ نہ پڑ جائے

صراط مستقیم دین اسلام یا اطاعت الٰہی کو کہتے ہیں، قرآن نے یہ بھی بتایا ہے

اسلام یعنی طاعت الٰہی (نہ کہ طاعت نفس و طاغوت) ہی صراط
مستقیم ہے۔ ان اللہ ربی و ربکم، فاعبدوہ، ھذا صراط مستقیم

نوٹ۔ یہاں بھی نوٹ کر لیجئے کہ فاعبدوہ میں رب الناس کی بے چون و چرا اطاعت
یعنی عبودیت و غلامی ہی کے لئے کہا گیا ہے۔ عبادت یا پرستش کے ترجمے سے اس
لفظ کا اصلی مفہوم ہی غائب ہو جاتا ہے۔

صراط: پس منظر

عرب جاہلیہ کے لوگ تاجر تھے۔ وہ ایرانی
اور رومی تجارتی و فوجی شاہراہوں سے
واقف تھے۔ لہذا وہ صراط کے پورے مفہوم کو سمجھتے تھے۔ اہل لغت

نے صراط کا عربی ترجمہ سبیل یا طریق دیا ہے جس کا فارسی ترجمہ راہ یا اردو رستہ کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مدینہ میں زیادہ رائج تھا اس لئے بھی اس آیت کو مدنی کہا جا سکتا ہے۔

صراط رومی لفظ STRATA صطراطا ہے۔ اس کا ترجمہ شاہ راہ ہو سکتا ہے۔ رومی سلطنت نے سڑکوں کی فوجی اور تجارتی اہمیت کو ایرانیوں کی طرح سمجھ لیا تھا اور اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک محکمہ قائم کر کے ایک مخصوص گورنر کے ماتحت کر دیا تھا۔

یہ صراطیں رومہ سے ہر مفتوحہ ملک کو جاتی تھیں اور یہ محاورہ بن گیا تھا کہ ہر سڑک رومہ کو جاتی ہے۔ ان سڑکوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہایت پختہ ہوتی تھیں، مستقیم یعنی سیدھی ہوتی تھیں ان میں کجی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے دونوں طرف پختہ دیواریں ہوتی تھیں اور فوجی حفاظت میں مسافر و تاجر آنکھ بند کر کے جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں پیدا ہو گئی تھیں جہاں ہر قسم کی آسائش کا سامان اور سواری اور مزدوروں کی آسانیاں تھیں۔ مسافر یا تاجر کا اس شاہراہ پر پڑ جانا اس کی کامرانی کے لئے کافی تھا۔ مختصر یہ کہ صراط کے معنی ہیں شاہراہ ایسی شاہراہ جس پر پڑ جانا ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا ہے

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است و خود ہم منزل است

اَلَّذِیْنَ قرآن کا روئے سخن عام انسانیت کی طرف ہے۔ انسانیت میں افراد و اقوام (شعوب قبائل) سب داخل ہیں جبھی کہیں وابستگی اخلاق اور اصلاح اعمال کے سلسلے میں واحد کا صیغہ

استعمال ہوا ہے وہ بھی اکثر عمومیت رکھتا ہے۔

بہر حال الذین کے سلسلہ میں مختلف قوموں کی بہت بڑی اکثریت کے متعلق تاریخی طور پر دیکھنا ہوگا کہ (۱) وہ کون سی قومیں گزر چکی ہیں جن پر اللہ کا فضل وانعام ہوا ہے۔ یعنی ان میں ہادی و مرسل آئے اور وہ قومیں ہدایت پر ونیک عمل (کتابی) بن کر یقین وایمان کی دولت سے سرفراز ہوئیں (۲) پھر اُن قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا جو ہدایت پانے کے بعد ظلم و طغیان میں گرفتار ہو کر غضب الٰہی میں مبتلا ہو گئیں یعنی خدا پرستی کو چھوڑ کر طاغوت پرست اور بدعمل بن گئیں اور آخر کار ذلت غلامی اور پستی و مسکنت میں پھنس کر یا تو تباہ ہو گئیں یا اب بھی نکبت و افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہیں (۳) تیسرے قسم کی وہ قومیں ہیں جنھیں کتابی زندگی بسر کرنے کا کوئی طریقہ اب تک معلوم نہیں ہوا اور وہ اُمیت کی وجہ سے تذبذب اور شک میں گرفتار ہیں اور یقین کی دولت نہ ملنے کی وجہ سے قطعی بے عمل ہیں۔ یہ مغضوب نہیں بلکہ ضالین میں سے ہیں اور دوراہے پر کھڑی ہوئی غور کر رہی ہیں کہ کس راستے پر چلیں۔

غرضکہ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کا مقصد وحدت ادیان حقہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہماری پوری سعی یہ ہونا چاہیئے کہ ہم کتابی، مغضوب اور اُمی اقوام کی تاریخ میں اُن اسباب علل پر غور کریں جن کی وجہ سے قومیں عروج و زوال کے نشیب و فراز سے گذرتی ہیں۔ اگر یہ نہ معلوم ہو سکے کہ اُن قوموں کے ہادی کون کون تھے تو کم از کم یہی معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی قوم عروج پر پہنچی تھی تو کس تعلیم و عمل نے اس کو عروج پر پہنچایا تھا اور مغضوب

ہوئی تو اس کے کیا وجوہ تھے۔

روانیت (روحانیت) اور علم

جہاں تک حقیقی اسلام کی تعلیم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا ایک ہی سبق ہے کہ نفس (روال) کو اساس و اصل مانا جائے اور ہر عمل کی جزا کا یقین واثق ہو تو ترقی ناگزیر ہے۔ اس طرح انسان کا جوشِ عمل بڑھ جاتا ہے اور خود غرضی بھی ایثار بن جاتی ہے۔ یعنی علم راز میں نہیں رکھا جاتا اور انسانوں کی مشترک سعیِ پیہم رکاوٹوں کے پہاڑوں کو خس و خاشاک بنا دیتی ہے۔

اجارہ داری

لیکن جب کبھی ذہنی یا جسمانی اشتراک کو ختم کر دیا جاتا ہے اور علم و عمل خود غرضوں کا آلہ بن کر صرف چند افراد کی فلاح تک محدود کر دیا جاتا ہے تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ تاریخ کو اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ اس قوم میں بعض افراد ظالم نہیں ہیں واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (الانفال) سے یہی مراد ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مترفین یا اولی النعمہ (علم و عمل کے لیڈر) ہی اپنی قوم کے قوائے عقل و عمل کے اجارہ دار بن جائیں تو باوجودیکہ اس قوم میں چند افراد مساوات انسانی کے قائل بھی ہوں لیکن سب کے سب مغضوب ہیں گے تا آنکہ کتابی سلطنت ایسے قوانین نافذ کرے کہ ہر شخص کی قلب ماہیت ہو جائے اور ضلال ناممکن ہو جائے۔

قصہ مختصر اگر کشتی طوفان میں رہ گئی تو سب مریں گے اور طوفان سے بچ نکلی تو سب بچیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تالاب کے چند قطرے تو طاہر

اور پورا تالاب نجس رہے۔

لہٰذا "اَلَّذِین" سے پوری قوم کی قوم مراد ہے اور مومن کو حکم دیا جاتا ہے کہ جن پرانی یا موجودہ قوموں کو تم خدا پرستی اور ترقی کے راستے پر دیکھو ان کی پیروی کرو اور ان کے مصلحول اور ہادیوں کی باتوں پر عمل کر کے دین و دنیا میں سرخرو ہو

انعام: پس منظر کسی آقا کا سب سے بڑا انعام جو اپنے عبد پر ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے تاکہ وہ اللہ کے عطا کئے ہوئے انعامات یعنی عقل و شعور و قوائے جسمانی کا پورا پورا اور صحیح استعمال آزادی کے ساتھ کر سکے۔ اس کا عمل اپنے آقا کے بھلے کے لئے نہ ہو بلکہ خود اپنے لئے یا اپنی نوع کے لئے ہو۔

الذین انعمت علیہم میں ان عاملین یا قوموں کا ذکر ہے جو خدا کے فضل و کرم سے حریت و آزادی سے بہرہ ور تھیں یعنی سیاسی طور پر کسی دوسری قوم کی غلام نہ تھیں اور اندرونی طور پر ان کی عقلوں پر کبھی وحبر یا پروہت و ساحر چھائے ہوئے نہ تھے اور نہ ایک مطلق العنان بادشاہ (مثل فرعون وغیرہ) کی ظالمانہ ربوبیت کے شکار تھے مختصر یہ کہ ان کے قوائے عقل و جسم صرف رب العالمین کی عبودیت کر سکتے تھے اور نوع انسانی کی فلاح میں مصروف تھے۔ انھیں نہ تو بادشاہوں نے رب بن کر ضلالت میں ڈالا تھا۔ نہ پروہتوں نے صراط مستقیم (اطاعت الٰہی) سے ہٹا کر اپنی اطاعت میں لگایا تھا۔

یہ کون سی قومیں تھیں؟ کیا مصری غلامی کی حالت میں بنو اسرائیل ایسی قوم تھی۔ یا فرعون اور اس کے پروہتوں کے سحر میں پھنسی ہوئی خود

مصری قوم ذہنی طور پر آزاد تھی اور اس پر اللہ کے انعامات ہو رہے تھے تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ مصری غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد جب اسرائیلیوں کی ایک دولتِ کتابیہ قائم ہوئی تو وہ کچھ عرصے تک اللہ کے انعام آزادی سے فیضیاب رہی۔ اسی طرح یونان و روما کی قدیم جمہوریتیں بھی ایک حد تک کتابی کہی جا سکتی ہیں۔

انعام اور قرآن

قرآن میں نعیم کے مقابلہ میں جحیم۔ نعمت کے مقابلے میں غضبِ الٰہی کا لفظ اکثر سورتوں میں استعمال ہوا ہے حدیثِ قدسی و متواتر میں بھی نعمت کا لفظ حج کی دعاؤں میں شامل ہے (ان الحمد و النعمۃ لک۔ والملک لا شریک لک) اس پر غور کیجئے تو صاف ظاہر ہے کہ نعمت یعنی آزادی اور ملک یعنی سلطنت بخشنے والا اللہ ہی ہے اور بغیر اس سیاسی تصور کے سورۃ الحمد کے الفاظ انعمت اور مٰلک یوم الدین کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

غضب: پس منظر

اوپر کی عبارت سے یہ ثابت ہے کہ انفرادی غضبِ الٰہی غلامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے خواہ وہ غلامی ذہنی ہو یا جسمانی یا دونوں ہوں۔ اجتماعی طور پر بھی وہ قوم غضبِ الٰہی میں مبتلا سمجھی جائے گی جو سیاسی طور پر کسی غیر قوم کی غلام ہو۔ یا خود اس قوم میں ارباب من دون اللہ نے اپنے آپ کو رب بنا لیا ہو اور لوگوں کے جسم و جان پر اپنی خدائی کا سکہ چلا رہے ہوں۔ گویا مشرک و مغلوب ہونا مغضوب ہونے کے مترادف ہے۔

غضب اور قرآن

جب تک یہودی قوم مصری یا بابلی غلامی میں تھی وہ مغضوب تھی سیاسی طور پر آزاد ہونے کے

بعد بھی رہبوں اور حبروں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہونا بھی غضب الٰہی میں مبتلا ہونا تھا۔ قرآن میں ایسی ہی قوموں کو مغضوب علیہم بتایا گیا ہے۔

ضالین

ضال کے ایک معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص رستے سے بھٹک جائے۔ راستے سے بھٹکانے میں شیطنت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ پیر وبت وساحر بھی بہکانے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ یا خود انسان اپنی جہالت سے یہ سمجھتا ہے کہ جس راستے پر میں چل رہا ہوں وہ غلط نہیں ہے اور ہوائے نفس کے دھوکے میں آکر صحیح راستہ چھوڑ دیتا ہے
اس قسم کی ضلالت سے بچنے کے لئے خدا سے دعا مانگی گئی ہے

خدایا تو ہمیں شیطان کے فریب سے نجات دے

دوسری قسم کی ضلالت وہ ہے جو تلاش راہ پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی انسان نے راہ ہی نہ پائی ہو اور وہ دوراہے پر کھڑا ہو کر راہ حق کی تلاش میں سرگرم ہو۔ اس حالت سے بھی خدا ہی نکالتا ہے۔ خود رسول اللہ کو خدا نے تلاش و جستجوئے حق کی حالت میں پایا اور انھیں راہ یقین یا صراط مستقیم پر ڈال دیا (وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ)

لہٰذا ہر مومن کی دعا ہے کہ جو لوگ غضب الٰہی میں پڑ گئے ہیں یا راستہ بھول گئے ہیں یا بہکا دیے گئے ہیں یا شک سے نکل کر یقین کے راستے پر آنا چاہتے ہیں سب کو خدا صراط مستقیم پر ڈال دے یعنی وہ اللہ کو اپنا آقا مان لیں اور اس کے بندے (غلام) بن کر دنیا کو جنت نعیم بنا دیں یہ روحانی جنت صرف رضائے الٰہی پر شاکر ہونے اور اس کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے۔

ضلال اور صراط

الحمد کی تیسری یعنی آخری آیت میں "صراط" یعنی شاہراہ کی رعایت سے ہدایت اور ضلال کے معنی سمجھنا چاہیئے۔ صراط مستقیم کو دین قیم بھی کہا گیا ہے۔ یعنی صراط اور دین ہم معنی لفظ ہیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ "ہدایت" دین قیم پر پڑنے کو کہتے ہیں۔ یعنی خدا کو اپنا آقا ماننا اور غلام کی طرح اس کے حکموں پر چلنا۔ اصلی دین، اصلی اسلام اور سیدھی شاہراہ ہے۔ اس غلامی یا بندگی کے تین طریقے (راستے) ہیں۔

(۱) ایک طریقہ تو یہ ہے کہ خدا کے رب ہونے کا یقین کامل ہو۔ اور اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے اور نہ کسی سے مدد مانگی جائے یہی دین ابراہیم یا اسلام (طاعتِ الٰہی) ہے جس میں شرک فی العبودیت کی گنجائش نہیں۔ دوسرے آقاؤں سے بغاوت اور صرف ایک آقا کا غلام ہونا ہی اسلام و عبودیت الٰہی اور خداپرستی ہے (ایمان باللہ)

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس خداپرستی کے راستے پر چلنے والوں میں اہل غرض ریا و جبر و زبردست پیدا ہو کر خود اپنے نفع کے لئے لوگوں کو ایسا راستہ بتلانے لگیں جو اللہ کی بندگی سے ہٹا کر اپنی بندگی کرانے لگیں یا لوگ ہوائے نفس کو الٰہ ماننے لگیں۔ یہ شرک فی العبودیت ہے۔ جو لوگ جان بوجھ کر اس شرک و خودپرستی میں مبتلا ہوئے ان کی عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ اُن سے بڑھ کر کون مغضوب ہو سکتا ہے! یہ شرک ہی غضب الٰہی ہے۔ آزاد اور مومن ہونے کے بعد ارباب من دون اللہ کا غلام اور مشرک بن جانا ہی غضب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے۔ یعنی المولیٰ غلامی سے نکل کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غیروں کی غلامی کرنا۔ نعمتِ ایمان کو چھوڑ کر غضب شرک میں مبتلا ہونا بدترین طریقہ سفر ہے۔ اس طرح منزل مقصود یعنی فلاح دارین تک پہنچنا ناممکن ہے۔ دنیا میں ذہنی وجسمانی غلامی کا نتیجہ سوائے ذلت و مسکنت کے کچھ نہیں اور عاقبت یا آخرۃ میں جو رسوائی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ غرضکہ آزاد اور مومن باللہ ہونا سب سے بڑا انعام اور بہترین دین یا صراط ہے۔ غلام یا مشرک ہونا بدترین راہ ہے جو ذلت کے غار میں ڈال دیتی ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ راستے یعنی دین کی تلاش ہو تاکہ منزل تک پہنچا جا سکے۔ ایسا متلاشی نہ گمراہ ہے نہ صحیح راستے پر ہے۔ مثلاً خود رسول اللہ اس دین کی تلاش میں تھے۔ جب راستہ یعنی دین ابراہیمی کی حقیقت آپ پر روشن ہو گئی تو آپ سچے اللہ کے بندے (عبدہٗ) بن گئے یعنی آپ کو ہدایت مل گئی اور آپ تذبذب (ضلال) اور تلاش راہ کی کشمکش سے نکل کر یقین یعنی خدا پرستی کی شاہراہ پر پڑ گئے (ووجدک ضالاً فھدیٰ) اس لیئے ضلال کو گمراہی نہ کہنا چاہیے بلکہ تلاش حق یا جستجوئے دین کہنا چاہیے

خود فریبی کو بھی ضلال کہتے ہیں جیسا کہ حضرت یعقوب کے لڑکوں نے ان سے کہا کہ آپ اسی ضلال (دھوکے یا خود فریبی) میں ہیں کہ حضرت یوسف زندہ ہیں (دیکھئے سورہ یوسف) انکَ فی ضلالک القدیم

بہرحال ضلال کی حالت، شک یا دھوکے کی حالت ہے یہ حالت صحیح رستہ نہ جاننے کی یعنی جہالت و نادانی کی ہے۔ اس حالت میں عقل حیران اور ذہن و روح پریشانی میں مبتلا رہتی ہے۔ انسان راحت و تسکین سے دور ہو جاتا ہے۔ اور اگر جذبۂ تلاش کی رہنمائی خدا کرے تو اس پر خدا کا یہ انعام ہوتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پا جاتا ہے اور یقین تک پہنچ جاتا ہے۔

سورۃ الحمد کے الفاظ کا قرآنی مفہوم

پس منظر سورۃ الحمد کی پہلی دو آیتوں کو شعب ابی طالب تک کے قرآن کے بعد رکھئے اور آخری یعنی تیسری آیت کو بعد ہجرت مدینہ غزوۂ بدر سے پہلے جگہ دیجئے جب کہ یہود نے سریہ عبداللہ بن جحش کے بعد تحویلِ قبلہ پر اعتراض کیا تھا اور پھر پوری سورۃ کو پس منظرِ اسلام کی روشنی میں دیکھئے۔

مختصر مفہوم الفاظ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہایت ہی مشکل کام ہے خصوصاً اس حال میں جب کہ کسی لفظ کو اسی قدیم تصور میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے جس میں اس تصور کو ہزار دو ہزار سال پہلے سمجھتے تھے۔ اسی لئے ہم نے ہر لفظ کے پورے مادہ اور ماعلیہ کو بیان کرنے کے بعد اب ان کے مختصر مفہوم کو بیان کر دیا ہے اسے ترجمہ نہیں بلکہ ترجمہ کی کوشش کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ حمد۔ احسانات کا عملی اعتراف۔ شکر گذاری۔ خدا کے حکموں پر چلنا خدا کی غلامی (نہ کہ زبانی تعریف)

۲۔ اللہ۔ خالق کائنات۔ ربِ اکرم۔ معبود اکبر و اعلیٰ (نہ کہ اہرمنِ نفس)

۳۔ رب: آقا۔ صاحب۔ مالک۔ خداوند (نہ کہ پروردگار)

۴۔ العالمین: انسان۔ لوگ۔ قومیں (قوم انس و جن) (نہ کہ کل عالموں)

۵۔ رحمان: اللہ (نصرانی رحمانان کہتے تھے) یہ اسم علم ہے۔

(نہ کہ بڑا مہربان)

(۶) مَلِكِ - بادشاہ - چودھری - قاضی (نہ کہ مالک)

(۷) یوم الدین قانونی فیصلے کا دن (اس دن اللہ بحیثیت قاضی کے آخری فیصلہ کرے گا - آج اللہ ملک یا قاضی نہیں ہے کل ہوگا)

(۸) نعبدُ - عبد یعنی بندہ - غلام - مملوک رب کی نسبت سے ہے (ہم تیری غلامی خوش دلی سے کرتے ہیں - ہم راضی برضائے رب ہیں یا ہم ہر حکم ماننے پر تیار ہیں (نہ کہ پوجا)

عبادت یا پرستش سے عبودیت کا مفہوم ادا نہیں ہوتا)

(۹) نستعین - ہم مدد مانگتے ہیں - ہم بھروسہ رکھتے ہیں (صبر و صلوٰۃ کے ذریعے سے مدد مانگنا)

(۱۰) ھدایت - راہ پر پڑنا - صحیح طریق عمل - سچا ایمان و ایقان (اللہ اور یوم آخر کا ماننا)

(۱۱) صراط : شاہراہ (نہ کہ رستہ)

(۱۲) اَلّذِین : گذشتہ قومیں (یعنی تاریخ اقوام کا مطالعہ ضروری ہے (دیکھئے والعصر) (نہ کہ وہ لوگ)

(۱۳) صراط مستقیم - دین قیم - اسلام - عبودیت رب - خدا پرستی ایمان باللہ - یقین کی شاہراہ (نہ کہ سیدھا راستہ)

(۱۴) انعام - خدا پرستی یا صراط مستقیم - یقین و ایمان - روحانی طمانیت - معرفت الٰہی - آزادی و مساوات - حکومت

(۱۵) غضب - غیر اللہ کی غلامی - شرک (فرقہ بندی - تحزب عدم مساوات انسانی - غلامی -

(۶۱) ضلال ۔ بھٹکتے پھرنا ۔ بھول چوک ۔ دھوکا ۔ شک وتذبذب صحیح راستے کی تلاش ۔ ذہنی پریشانی ۔ روحانی کرب ۔ عدم علم نادانی (نہ کہ گمراہی)

پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں

سورۃ الحمد کا قرآنی مفہوم

سورۃ الحمد کی تین آیتیں ہیں۔ اس کی پہلی دو آیتیں مکی ہیں اور آخری آیت مدنی ہے ۔ اگر اس کی پہلی آیت میں جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کو الگ الگ ایک آیت تسلیم کر لیا جائے تو اس کے پانچ حصے بن جاتے ہیں۔ جن میں اگر بار بار الحمد کو نہ ملایا جائے تو مکمل آیت نہیں بنتی مثلاً (۱) الحمد للہ (۲) رب العالمین (۳) الرحمان (۴) الرحیم (۵) مالک یوم الدین۔ مکمل آیت جب ہی بن سکتی ہے کہ الحمد للہ ۔ کے بعد یوم الدین تک ایک آیت مانی جائے۔

اسی طرح آخری آیت اھدنا الصراط المستقیم سے الضالین تک مکمل ایک آیت ہے ۔ یہی قول جمہور علماء کا بھی ہے ۔ قرآن میں بار ہا کہا جا چکا ہے کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پہلے دی جا چکی ہے (ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک: ان ربک لذو مغفرۃ و ذو عقاب الیم ۰ (۲/ ۴۳ السجدہ) اب ہم پس منظر کی روشنی میں ترتیب تنزیل کے مطابق سورۃ الحمد کا

مفہوم درج ذیل کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ مفہوم مکمل طور پر سورۂ الحمد کے مطالب کو بیان کرتا ہے۔

ترجمہ کرنا آسان نہیں ہوتا

بہتر یہ ہے کہ ترجمہ کی جگہ تفسیر کی جائے اور پھر اسی کے مختصر مفہوم کو بطور ترجمہ دے دیا جائے۔ حضرت امام الہند نے یہی طرز اختیار کیا ہے اس لئے ان کا ترجمان اداے مفہوم قرآنی میں اپنی بلندپایہ اور مخصوص جگہ رکھتا ہے اور چونکہ وہ ترجمہ نہیں تفسیر ہے اس لئے پوری تفسیر کو مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ترجمہ میں تھوڑی سی تبدیلی یا محاورہ کے فہم میں ذراسی مسامحت نسلاً بعد نسل کروڑوں انسانوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہے مثلاً عبرانی زبان کے لفظ ابن اللہ کا ترجمہ اللہ کا بیٹا کرکے کروڑوں عیسائی غلطی میں مبتلا ہوگئے۔ اگر وہ اس کا ترجمہ اللہ والا کردیتے تو حضرت مسیح کو نور اور حضرت مریم کو ام النور اور خدا کو حضرتِ مریم کا شوہر بنانے کی سعیِ لا حاصل نہ کرتے۔ اس کے سیدھے معنی تھے اللہ والا۔ جیسے شیطان کے بچے کے معنی ہیں بدمعاش۔ ہر زبان خصوصاً عربی میں اس طرح کے ہزارہا محاورے ہیں جن کا لغوی ترجمہ اصل مفہوم سے دور لے جاتا ہے۔ مثلاً بنتِ شفہ یا اُمِّ ہام، یا بنت عنب یا ابن الوقت وغیرہ۔ اسی طرح صحیح ترجمے کو چھوڑ کر استعارہ و تشبیہ سے مدد لینا بھی خطرناک ہے۔ جیسے رب کا ترجمہ پروردگار اور عالمین کا ہر ایک عالم کرنا اور نعبُد کو عبادت کے لئے مخصوص کرنا سورۃ الحمد کے مفہوم کو الجھا دیتا ہے۔

پہلی آیت ہم دل و جان سے اس معبودِ حقیقی کے سپاس گزار ہیں یا فرماں بردار غلام ہیں جو سب انسانوں کا آقا ہے جسے یہود و نصاریٰ وغیرہ رحمان (یا رحمانان) کہتے ہیں اور جو بڑا ہی مہربان ہے۔ وہی قانونی فیصلے کے وقت بحیثیت بادشاہ (یا قاضی) کے ایسا فیصلہ کرے گا جس میں کسی کو مجال دم زدن نہ ہوگی۔ ملک (یا قاضی) کی حیثیت سے اس کا فیصلہ دو ٹوک ہوگا یعنی اس میں کسی پر ظلم نہ ہوگا مگر اس کی رحمت اس کے عدل میں ضرور شامل ہوگی۔ شاہا تو ہی حشر میں احکم الحاکمین اور خیر الفاصلین ہوگا (اگرچہ تو نے آج ہمیں مہلت دے رکھی ہے اور شانِ حکومت و عدالت کو کل پر اٹھا رکھا ہے)۔

دوسری آیت اے خداوند! اے آقائے عالمیان ہم صرف تیرے بندے ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور خوش دلی سے بلا جبر و اکراہ یہ عہد کرتے ہیں کہ تیرے ہر حکم کو غلام ہونے کی حیثیت سے بچون و چرا بجا لائیں گے اس لئے کہ اس میں سراسر ہمارا ہی فائدہ ہے۔ نہ ہم کسی اور کی غلامی کرتے ہیں۔ نہ سوائے تیرے کسی سے مدد مانگتے ہیں۔ تیرے سوا دکھی کی پکار سننے والا کوئی نہیں۔ ہم دوسروں کی طرح آہ و زاری کر کے تجھے مدد کے لئے نہیں پکارتے بلکہ صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ مشکلوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور صرف تیری ہی رحمت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنی مرضی تیری مرضی میں گم کر دیتے ہیں۔

تیسری آیت۔ خداوندا ہمیں اپنی غلامی و شکر گذاری کی سیدھی شاہراہ (اسلام) پر ڈال دے۔ یہ شاہ راہ اُن معزز کتابیوں اور باسعادت قوموں کی ہے جن پر تونے اپنی مادی و روحانی رحمتیں نازل کی ہیں۔ یہ اُن کی راہ نہیں ہے جو ناشکرے ہیں اور تو اُن سے خوش ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ ذلت و مسکنت میں دن گزار رہے ہیں۔ یہ راہ اُن لوگوں کی بھی نہیں ہے جو شاہراہ کو ڈھونڈھ رہے ہیں اور دوراہے پر شک تذبذب کے کانٹے ان کے دلوں میں چبھ رہے ہیں۔ یعنی وہ ابھی صراطِ مستقیم یا خداشناسی تک پہنچ کر یقین کی راحت و نعیم سے فیضیاب نہیں ہوئے کہ یقین کی بدولت دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کرتے۔

سورۃ الحمد کا مختصر مفہوم

(سات حصوں میں)

I

(۱) جملہ عملی سپاس گزاری سوائے اللہ (ال الہ) کے اور کسی کے لئے مناسب نہیں اس لئے کہ وہی سب لوگوں (یا قوموں) کا آقا ہے۔

(۲) جس کا (دوسری قوموں میں ایک) نام رحمان (بھی) ہے (اور وہ دوسرے آقاؤں یا دیوتاؤں کی طرح ظالم نہیں ہے بلکہ) بہت ہی رحم والا ہے۔

(۳) وہی روزِ جزا کا قاضی (یا بادشاہ) ہوگا (اور اس کے انصاف میں رحمت وعفو کا غلبہ ہوگا)

II

(۴) ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم صرف تیرے غلام (یا بندے) ہیں (کوئی دوسرا ہمارا آقا (یا رب) نہیں ہے — ہم صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں (کسی دوسرے سے مدد نہیں مانگتے اس لئے کہ وہ خود مخلوق ولاچار ہیں)

III

(۵) ہم کو سیدھی (یعنی مختصر ترین) شاہراہ پر ڈال دیجئے جو تیری بندگی کا دوسرا نام ہے۔

(۶) ہمیں ان لوگوں کی شاہراہ پر ڈال دے جن پر تو نے اپنا فضل وکرم کیا ہے (یعنی وہ خدا پرست قومیں جو پہلے گزر چکیں یا اب بھی موجود ہیں اور تیرا حکم مانتی ہیں اس لئے آزاد ہیں)

(۷) خداوندا ہمیں ان لوگوں کی راہ پر نہ ڈال جن سے تو خفا (ناخوش)

ہوا۔ نہ ان لوگوں کی راہ پر ڈال جو ابھی تک شک میں مبتلا ہیں۔ اور خدا شناسی کے یقین تک نہیں پہنچے بلکہ دوراہے پر کھڑے ہوئے اور حیران ہیں کہ کدھر جائیں۔ (اس لئے غلامی میں مبتلا ہیں)

ہند میں قرآن کے اردو ترجمے

قرآن کا غالباً پہلا فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندوستان میں کیا۔ اس سے پہلے ۸۹۷ھ میں بعہد سلطان حسین مرزا ملا کاشفی ترجمہ کیا تھا۔ اُن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) حمد مر خدائے را کہ پروردگار جہانیانست (۲) بخشایندۂ مہربان (۳) خداوند روز جزا (۴) ترا می پرستیم واز تو یاری می طلبیم ۵ (۵) ہدایت کن مارا راہ راست (۶) راہ آنانکہ انعام کردی برایشاں (۷) نہ غضب شدہ بر آنہا ونہ گمراہان ۵ (ملا حسین واعظ کاشفی ہروی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حمد، ہدایت، انعام اور غضب کا ترجمہ ہی نہیں کیا اور عالمین کا ترجمہ جہانیان کیا ہے جو تفسیر قرآن بالقرآن کے مطابق ہے۔

ہم ذیل میں اُن اردو ترجموں کو درج کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد ہوئے ہیں اور جو ہمیں مل سکے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو مترجمین کی اکثریت نے حضرت شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ کا ترجمہ کیا ہے۔ ان ترجموں میں وہ تفسیریں شامل نہیں ہیں جو سورۃ الحمد اور قرآن کی مختلف اہل علم نے کی ہیں۔ ہمارے لئے ان کا خلاصہ تیار کرنا مشکل تھا۔ ان کے علاوہ قرآن کریم کے بہت سے انگریزی ترجمے بھی ہندوستان میں ہوگئے ہیں جن میں ڈاکٹر مرزا ابوالفضل کا

ترجمہ قابل ذکر ہے اس لئے کہ انھوں نے دو جلدوں میں ترتیب نزول قرآن کے مطابق مختلف سورتوں کو جرمن مستشرقین نوئل ڈیکے اور ویائل کی ترتیبوں سے اخذ کر کے عربی متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ اردو تفسیر حقانی سے ماخوذ ہے جس کی انگریزی قابل داد ہے اور بہت سے تشریحی نوٹ خاص طور پر اہم ہیں اس لئے کہ وہ یورپ کے علوم و تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ محمد مارماڈیوک پکتھال کے ترجمہ انگریزی کو بھی ہندوستان کا کہا جا سکتا۔ اس لئے انھوں نے اس کا بیشتر حصہ یہاں تیار کیا تھا۔

حضرت امام الہند کے کتب خانہ میں ایک خطی ترجمہ فارسی ہے جس پر مترجم کا نام نہیں ہے۔ حاشیہ پر تفسیری اشارات ہیں علمین کا املا عالمین اور ملک کا مالک ہے۔ اس میں سورۃ الحمد کا ترجمہ یہ ہے۔

(۱) شکر و ثنا مر خدائے را کہ پروردگار جہانیان است

(۲) خداوند روز جزا است۔

(۳) ترا مخصوص می پرستیم واز تو یاری می خواہیم

(۴) راہ نمائے مارا راہے راست (محبت خویش)

(۵) راہ آنانکہ نکوئی کردی برایشان (از انبیا و اولیا)

(۶) نہ راہ کہ خشم گرفتہ برایشان بسبب جہالت (چوں یہود)

(۷) و نہ راہ گمراہان (چوں نصاریٰ)

علمائے افغانستان نے شاہی حکم کے مطابق ۱۳۲۲ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے اردو ترجمہ سے فارسی ترجمہ

کیا ہے۔ یہ ترجمہ درج ذیل ہے۔

(۱) ہمہ ستائش مر خدائے راست

(۲) آں خدائیکہ پروردگارِ عالمیان است (عا۔ از ہر جنس عالم چوں عالم جن - عالم فرشتہ - عالم انس وغیرہ) ترجمہ عالمیان بمعنی جہانیان درست ہے لیکن اس میں عالم ملکوت کو شریک کرنا درست نہیں)

(۳) بے اندازہ مہربان، نہایت با رحم

(۳) خداوند روز جزا است

(۴) خاص ترا می پرستیم و خاص از تو یاری می خواہیم۔

(۵) بنما ما را راہ راست

(۶) راہ کسانیکہ انعام کردہ بر ایشاں۔

(۷) نہ آنانکہ غضب کردہ شدہ بر ایشاں و نہ گمراہان۔

جتنے اردو اور فارسی ترجمے ہیں، ان پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ ہر مترجم نے دوسرے کے مقابلے میں ترجمہ کو آسان اور قریب الفہم بنانے میں کیا کیا سعی کی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مختلف زبانیں اپنے قدیم مفاہیم کو بدل رہی ہیں اور صرف ترجمہ سے قرآنی مفہوم پر حاوی ہونا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

سورۃ الحمد کے وہ ترجمے جو ہند میں ہوئے

نمبر سلسلہ	نام مترجم	سال ترجمہ	زبان	متن الحمد للہ
۱	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	سنہ ۱۱۵۲ھ / سنہ ۱۷۳۸ء	فارسی	ستائش خدارا است
۲	شاہ عبدالقادر محدث دہلوی	۱۲۰۵	ہندوی	سب تعریف اللہ کو ہے۔
۳	شاہ رفیع الدین محدث دہلوی	۱۲۵۶ھ مطبوعہ	اردو	سب تعریف واسطے اللہ کے ہے
۴	مولانا عبدالسلام	۱۲۵۹	نظم اردو	جملہ خوبی خدا کو ہے شایاں
۵	سر سید احمد خاں دہلوی	۱۲۹۷	اردو	سب بڑائیاں خدا ہی کے لئے ہیں
۶	مولانا عبدالحق حقانی دہلوی		اردو	ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لئے ہے
۷	مولانا فتح محمد تائب لکھنوی	سنہ ۳۰۹ مطبوعہ	〃	سب تعریف واسطے اللہ کے
۸	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۱۳۱۷	〃	ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے
۹	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	۱۳۱۸	〃	ہر تعریف اللہ ہی کو زیبا ہے
۱۰	مولانا وحید الدین حیدرآبادی	آخر سنہ ۱۳۲۳ء	〃	اصل تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے
۱۱	میرزا حیرت دہلوی		〃	سب تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے
۱۲	ڈاکٹر عبدالحکیم کرنال	۱۳۲۴	〃	تمام حمد اللہ کے واسطے ہے
۱۳	مولانا ثناء اللہ امرتسری	۱۳۲۵	〃	سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں
۱۴	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۳۳۳	〃	سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں
۱۵	مولانا احمد علی لاہوری غلام احمد	۱۳۴۰	〃	سب تعریف اللہ کے لئے ہیں
۱۶	مولانا محمود حسن دیوبندی	۱۳۴۸	〃	سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں

۱۷ خواجہ حسن نظامی دہلوی	۱۳۴۰	اردو	ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے
۱۸ " "		ہندی	"
۱۹۔ مولانا احمد علی لاہوری (خادم دین)	۰	اردو	سب تعریف اللہ کو ہے
۲۰ مولانا فتح محمد جالندھری		اردو	سب طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے
۲۱۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی	۱۳۴۲	اردو	سب خوبیاں اللہ کو ہیں
۲۲ شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی	۰	ہندی	سب سراہت من موہن کو ہے۔
۲۳ حافظ سید فرمان علی۔ اثنا عشری۔ دربھنگوی	۱۳۲۶	اردو	سب تعریف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے
۲۴۔ مسٹر عبدالماجد دریابادی	۱۳۷۱	۔	(ساری) تعریف اللہ کے لئے ہے

رب العالمین	الرحمن الرحیم
۱۔ پروردگار عالمہا	بخشائندہ۔ مہربان
۲۔ جو صاحب سارے جہان کا	بہت مہربان۔ نہایت رحم والا
۳۔ پروردگار عالموں کا	بخشش کرنے والا مہربان
۴۔ کہ ہے پروردگار عالمیان	کہ بہت مہر و رحم وا ہے جس کی رحمت بیاں سے بالا ہے
۵۔ جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے	بڑا مہربان اور بڑا رحم والا ہے۔
۶۔ جو کل جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے	جو نہایت رحم کرنے والا ہے
۷۔ پالنے والا تمام جہان کا	بڑا مہربان نہایت رحم والا
۸۔ (جو) تمام جہان کا پروردگار (ہے)	نہایت رحم والا۔ مہربان
۹۔ جو تمام جہان کا پروردگار	نہایت مہربان۔ رحم والا

۱۰- جو سارے جہان کا پروردگار	بڑا مہربان۔ رحم والا۔
۱۱- جو سارے جہان کا پروردگار	بہت مہربان۔ رحم والا
۱۲- جو تمام عالموں کا رب ہے	جو رحمان اور رحیم ہے۔
۱۳- جو سب جہانوں کا پرورش کرنے والا	بڑا مہربان۔ نہایت رحم والا۔
۱۴- (تمام) جہانوں کا رب	بے انتہا رحم والا۔ نہایت رحم کرنے والا
۱۶- جو پالنے والا سارے جہان کا	بے حد مہربان۔ نہایت رحم والا
۱۷- جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے	(اور جو) بہت بخشش کرنے والا از حد مہربان ہے
۱۸- جو صاحب سارے جہان کا	بہت مہربان۔ نہایت رحم والا
۱۹- جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے	بڑا مہربان۔ نہایت رحم والا۔
۲۰- جو مالک سارے جہان والوں کا	بہت مہربان۔ رحمت والا۔
۲۱- جو سارے سنسار کا پالن ہارا	بڑی میا، موہ کا۔ مہر والا ہے۔
۲۲- جو سارے جہان کا پالنے والا	بڑا مہربان۔ رحم والا
۲۳- (وہ) سارے جہان کا مربی	(وہ) نہایت رحم کرنے والا
	(وہ) بار بار رحم کرنے والا

مٰلِکِ یوم الدّین	اِیّاکَ نعبُدُ
۱- خداوند روز جزا	ترا می پرستیم
۲- مالک انصاف کے دن کا	تجھی کو بندگی کریں
۳- خداوند دن جزا کا	تجھ ہی کو عبادت کرتے ہیں ہم
۴- کہ وہی بادشاہ روز جزا (شاہی) اسی کی ہے اسی کو سزا	تجھ کو ہی کرتے ہیں عبادت ہم

۵ ۔ حاکم ہے انصاف کے دن کا	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔
۶ ۔ جزا کے دن کا مالک ہے	ہم تیری عبادت کرتے ہیں
۷ ۔ مالک دن قیامت کا	تیری ہی بندگی کرتے ہیں ہم
۸ ۔ روزِ جزا کا حاکم	(اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں
۹ ۔ مالک ہے روزِ جزا (یعنی قیامت) کا	خداوندا تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں
۱۰ ۔ انصاف کے دن کا مالک	ہم تیری بندگی کرتے ہیں (یعنی تیری ہی پوجا کرتے ہیں)
۱۱ ۔ انصاف کے دن کا مالک ہے)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔
۱۲ ۔ اور روز انصاف کا مالک ہے	خاص تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں
۱۳ ۔ قیامت کے دن کا مالک	تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔
۱۴ ۔ جو مالک ہیں روز جزا کے	ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں
۱۵ ۔ جزا کے وقت کا مالک	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔
۱۶ ۔ مالک روز جزا کا	تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں
۱۷ ۔ جو روزِ جزا کا مالک (یعنی قیامت کے دن کا بادشاہ ہے)	سب سے منہ موڑ کر ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔
۱۸ ۔ مالک انصاف کے دن کا	تجھی کو ہم بندگی کریں
۱۹ ۔ انصاف کے دن کا حاکم ہے	اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں
۲۰ ۔ روزِ جزا کا مالک	ہم تجھی کو پوجیں
۲۱ ۔ جس کے بس میں چکوتی کا دن ہے،	ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں۔
۲۲ روزِ جزا کا حاکم ہے	خدایا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں
۲۳ (وہ) مالک روزِ جزا کا	ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

وایاک نستعین	اهدنا الصراط المستقیم
۱ ۔ و از تو مدد می طلبیم	بنما مارا راه راست
۲ ۔ اور تجھی سے مدد چاہیں	چلا ہم کو راہ سیدھی
۳ ۔ اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں	دکھلا ہم کو راہ سیدھی
۴ ۔ اور تجھ سے ہی استعانت ہم	کر ہدایت ہمیں وہ سیدھی راہ (کہ مراد اس سے ہے کتاب اللہ)
۵ ۔ اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں	ہم کو سیدھی راہ پر چلا
۶ ۔ اور تجھ ہی سے ہر کام میں مدد مانگتے ہیں	ہم کو سیدھے راستے پر چلا ۔
۷ ۔ اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ہم	چلا ہم کو راہ سیدھی
۸ ۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	ہم کو دین کا سیدھا رستہ دکھا
۹ ۔ اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں	دکھا ہم کو سیدھا رستہ
۱۰ ۔ " "	ہم کو سیدھے رستے پر چلا
۱۱ ۔ " "	ہمیں سیدھی راہ دکھا ۔
۱۲ ۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت کر
۱۳ ۔ " "	ہمیں سیدھی راہ پر پہنچا ۔
۱۴ ۔ آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں	بتلا دیجئے ہم کو سیدھا رستہ
۱۵ ۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا
۱۶ ۔ " " " چاہتے "	بتلا ہم کو راہ سیدھی
۱۷ ۔ اور تجھی سے مدد چاہیں	چلا ہم کو راہ سیدھی
۱۸ ۔ " "	"

۱۹ - اور تجھی سے مدد چاہیں	چلا ہم کو راہ سیدھی
۲۰ - اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں	ہم کو سیدھے رستے پر چلا
۲۱ - اور تجھی سے مدد مانگیں	ہم کو سیدھا راستہ چلا
۲۲ - اور تیرا ہی آسرا چاہتے ہیں	چلا ہم کو سیدھی راہ (ڈگمگ نہیں)
۲۳ - اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں	تو ہم کو سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھ
۲۴ - اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں	چلا ہم کو سیدھا راستہ

صراط الذین انعمت علیہم	غیر المغضوب علیہم
۱ - راہ آنانکہ اکرام کردہ بر ایشاں	بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد بر آنہا
۲ - راہ اُن کی جن پر تو نے فضل کیا	نہ اُن کی جن پر غصہ ہوا۔
۳ - راہ ان لوگوں کی نعمت کی ہے تو نے اوپر ان کے	سوا اُن کے کہ غصہ کیا گیا ہے اوپر اُن کے۔
۴ - راہ اُن کی ہمیں ہدایت کر تو نے انعام کر لیا جن پر	نہ سوا اُن کے جو کہ تھے مغضوب تھے جو محروم سب سے اور مسلوب
۵ - اُن لوگوں کی راہ جن پر تو نے بخشش کی ہے	نہ ان کی راہ جن پر تیرا غصہ ہوا ہے
۶ - ان کے رستے پر جن پر تو نے فضل کیا	نہ اُن کے رستے پر جن پر تیرا غضب نازل ہوا
۷ - راہ اُن کی نعمت کی تو نے جن پر	نہ غضب کیا گیا جن پر
۸ - ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے اپنا فضل کیا	نہ اُن کا جن پر تیرا غضب نازل ہوا
۹ - ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے فضل فرمایا ہے	نہ ان کا جن پر غصہ ہوا ہے
۱۰ - ان کا رستہ جن پر تو نے کرم کیا	نہ ان کا جن پر غصہ ہوا۔
۱۱ - ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے فضل کیا ہے	نہ اُن کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا

۱۲ - یعنی ان برگزیدوں کے راستہ کی جن پر تو نے انعام کئے	جو مغیر ہے اُن لوگوں کے راستے سے جن پر تیرا غضب ہوا۔
۱۳ - اُن لوگوں کی راہ جن پر تونے انعام کئے	نہ ان لوگوں کی جن پر غضب کیا گیا۔
۱۴ - رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا	نہ رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا
۱۵ - اُن لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا	نہ اُن کا جن پر غضب ہوا۔
۱۶ - راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا	نہ جن پر تیرا غصہ ہوا۔
۱۷ - ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے فضل و کرم کیا	ان کا نہیں جن پر غصہ کیا گیا
۱۸ - "	"
۱۹ - راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا	نہ اُن کی جن پر غصہ ہوا۔
۲۰ - ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا	نہ اُن کے جن پر غصہ ہوتا رہا
	"
۲۱ - رستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا	نہ ان کا جن پر غضب ہوا
۲۲ - اُن لوگوں کی راہ جن پر تیری دیا ہوئی	نہ اُن کی جن پر تیری جھنجھلاہٹ ہوئی
۲۳ - ان کی راہ جنھیں تو نے اپنی نعمت عطا کی۔	نہ ان کی راہ جن پر تیرا غضب ڈھایا گیا ہے۔
۲۴ - ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔	نہ اُن لوگوں کا رستہ جو زیرِ غضب آ چکے ہیں۔

ولا الضالین

(۱) بجز گمراہاں۔
(۲) اور نہ بہکنے والے۔
(۳) اور نہ گمراہوں کی۔
(۴) اور نہ گمراہوں کی وہ ہووے راہ
ایسی راہوں سے ہم کو رکھے نگاہ
(۵) اور نہ بھٹکنے والوں کی راہ
(۶) نہ گمراہوں کے رستے پر
(۷) نہ (راہ) گمراہوں کی
(۸) اور نہ گمراہوں کا
(۹) نہ بہکنے والوں کا
(۱۰) اور نہ اُن کا جو بہک گئے
(۱۱) اور نہ گمراہوں کی۔
(۱۲) اور جو گمراہ ہیں۔
(۱۳) نہ اُن کی جو گمراہ ہیں
(۱۴) نہ اُن لوگوں کا جو رستے سے گم ہو گئے
(۱۵) اور نہ گمراہوں کا
(۱۶) اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے
(۱۷) اور نہ اُن کا جو گمراہ ہیں۔
(۱۸) " "
(۱۹) اور نہ بہکنے والے
(۲۰) اور نہ گمراہوں کی۔
(۲۱) اور نہ بہکے ہوؤں کا
(۲۲) اور نہ گمراہوں کی
(۲۳) اور نہ گمراہوں کی
(۲۴) اور نہ بھٹکے ہوؤں کا
... ...

سیرتِ قرآنیہ "سیّدنا محمّد" صلّی اللہ علیہ وسلم

(لقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدکر؟)

بادشاہی اور جاگیرداری دور ختم ہو رہا تھا۔ جمہوری اور مشینی دور کی ابتدا تھی اس وقت امام ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کی انقلابی روح کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اربابِ حکومت اور امرا کے لئے تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی حکمت عقل، نقل اور کشف کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے تفسیر فتح الرحمان سے پہلے اسے اور المسوّی کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ متوسط طبقہ کے لئے شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۱۵۹ - ۱۲۳۹) نے تفسیر فتح الرحمان کے اصول کی تشریح کے لئے فتح العزیز لکھی اور جماعت سجائے ہیں جنہارگی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو قرآن و حدیث کا درس دیا۔ انھوں نے قرآن کو امت مسلمہ کے عام لوگوں کی ہندوی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ قرآنی دعوتِ انقلاب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی تھے۔

قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سیرۃ نبوی کے سلسلے میں اس کے تاریخی ادوار متعین کر لئے جائیں اور تاریخ تمدن انسانی کے پس منظر میں اسے اپنی اپنی زبان میں سمجھا جائے۔ اردو میں اس قسم کی مختصر سیرت سنگم کتاب گھر دہلی سے مل سکتی ہے۔ اسے بیت الحکمت سندھ نے بیس زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس سیرت میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمونہ "پہلا انقلاب ہی" اسطرح سیرت کے قرآنی مطالعہ سے متعدد غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور حکمتِ قرآنیہ فکرِ انسانی سے بہت قریب آجاتی ہے۔

سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار دہلی

اسلام کا اصلی ماخذ قرآن ہے

اپس منظر اسلام۔ چار حصوں میں
۱۔ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت
۲۔ اسلام سے پہلے عرب کی حالت
۳۔ مقدمہ سیرت سیدنا محمد صلعم
۴۔ حیات محمد تا قبل بعثت

مطبوعات
بیت الحکمت
دہلی
(ھند)

۴۔ اعلانِ انقلاب
سورۃ العلق کا مفہوم
یعنی
فلسفۂ وجود اور فلسفۂ علم کی بحث
کے بعد اسلام کی بنیادی تعلیم کا خلاصہ

۲۔ ترتیب نزول
قرآن کریم
احادیث کی مدد اور
خود قرآن کے داخلی
مطالعہ کے بعد قرآن
کی مختلف سورتوں اور
رکوعوں اور پھر آیتوں
کی ترتیب تنزیلی
بتائی گئی ہے اسکے
علاوہ اس سے پہلے
کی تحقیقاتیں بھی
درج کردی گئی ہیں۔

اُن نوجوان طلبہ کے نام
جو
اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال کا تاریخی ترتیب قرآن
اور تاریخ تمدن انسانی کی روشنی میں مطالعہ کرکے
اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں
اور
یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ فکر و عمل اسلام کی تعبیر میں
کیوں علمائے اسلام متفق الرائے نہیں

ارکین بیت الحکمت، دہلی (ہند)

۵۔ بیانِ انقلاب
مفہوم سورۃ الحمد
جس میں
ہندوستان کے
جو میں اردو ترجمے
بھی دئے گئے ہیں
اور
یہ دکھایا گیا ہے
کہ ترتیب تنزیلی
کے بغیر قرآن کریم
کا مطالعہ آسان
نہیں ہے۔

۳۔ مشکلات قرآن کا انقلابی حل
تفسیر بالرائے نے جو مشکلات فہم قرآن
میں پیدا کردی ہیں، ان کا انقلابی حل
ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں۔

سول ایجنٹ
سنگم کتاب گھر
اُردو بازار
دہلی

تحریر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ترتیب نزول قرآن کے مطابق فکر محمدی
اور قرآن کے ساتھ ساتھ عمل نبوی کو
پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے نمایاں کیا گیا ہے

پس منظر اسلام اور ترتیب نزولِ قرآن

کو چھوڑ کر تفسیر بالرائے کرنے کا یہ نتیجہ ہوا،
کہ مفہوم قرآن کثرت تعبیر سے مبہم بن گیا۔
اور جب ہمارا نوجوان، جو بے انتہا قوت عمل
کا مالک ہے، مذہبی کج بحثیوں سے نکل کر
حاشی لادینیت کا رُخ کرنے لگا، تو
یہ آذران فرقہ پرست اسی کو مجرم ٹھیرانے
لگے! یہ قصور دین کا ہی کہ دینی فرقہ سازوں کا؟

بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش!!!

سول ایجنٹ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی

قیمت فی جلد ایک روپیہ

مطبوعات بیت الحکمت - دہلی (ہند) (۳)

مشکلات قرآن کا انقلابی حل

پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں

محمد اجمل خاں

قرآن کریم کا انقلابی طرزِ خطاب

ہر مفکر سوچنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نثر سے پہلے شعر وجود میں آیا ہے۔ شعر میں احساسات وجذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فنکار خواہ وہ مصوّر ہو یا شاعر، مغنی ہو یا مہندس و بت تراش، اپنے لطیف جذبات کی تخلیق میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دوسرے بھی خود اُس کی طرح متاثر ہوں۔ اس تخلیق میں نثر کی سی خشک منطق اور محض دماغ کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔ شعر میں دل حاکم ہوتا ہے اور دماغ محکوم ۔ اور "معنی" یعنی احساس دل، روحانیت کے افق سے طلوع ہو کر الفاظ واستدلالِ دماغ کی "صورت" کو اپنے نور سے معمور کر دیتا ہے۔

یہ حسین تخلیق اگر نثر کی شکل میں جلوہ فرما ہو تو اسے خطابت کہتے ہیں۔ اس میں عقلی دلائل شاعرانہ معنویت کے ذریعے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں لیکن اگر نثر کو محض منطق وعقل کا لباس پہنا دیا جائے تو اس میں شعر وخطابت کی سی آفرینی نہیں رہتی۔

قرآنی طرزِ بیان میں نہ تو شاعری کی سی محض معنویت ہے، نہ نثر کی سی محض کرخت منطق۔ اس میں مخاطب کے افکار و ماحول کے مطابق وہ جادو بیانی ہے کہ دل و دماغ دونوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ یہی اس کے الہامی ہونے کا ثبوت ہے۔ اس طرزِ بیان نے دنیائے ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی نثر کو نظم اور نظم کو نثر کے پیرایہ میں لا کر دونوں میں جوشِ نمو و حیات بھر دیا۔ بہ الفاظِ دیگر عقل و ہوش کی تیرگی کو محبت وشوق کی تابانی سے پُر نور کر دیا۔

لقد یسّرنا القرآن للذّکر فھل من مدّکر؟

(خدانے قرآن کو نہایت ہی آسان طریقہ علم و عمل بنایا ہے۔ کوئی ہے جو اس پر عمل کرے؟)

مشکلاتِ قرآن

کا

انقلابی حل

محمد اجمل خاں

پہلا اُردو اڈیشن ۱۹۵۲ء (۱۳۷۲ھ)

جملہ حقوق اشاعت و ترجمہ وغیرہ بحق سیف الاسلام خاں (جامی)
در ممالک ہند و پاکستان و برما و سیلون محفوظ ہیں

مطبوعہ یُونین پرنٹنگ پریس، اُردو بازار جامع مسجد دہلی میں چھپی
اور
بیت الحکمت دہلی (ہند) کی طرف سے سیف الاسلام خاں جامی نے شائع کی

سول ایجنسی در ہند:۔ سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی (ہند)
سول ایجنسی در پاکستان:۔ مکتبہ بیت الحکمت۔ اردو بازار۔ لاہور (پاکستان)

قیمت فی جلد ایک روپیہ

فہرست عنوانات

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط وخال

از

محمد اجمل خاں

۱۔ پس منظر اسلام (چار حصے) ایک مجلد میں (ابتدائے عالم سے بعثت محمدی تک)

۲۔ ترتیب نزول قرآن کریم:۔ جس سے قرآن کریم کی تاریخی ترتیب معلوم ہو جاتی ہے قیمت صر

۳۔ مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم:۔ اس سیرت میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب سے پورے قرآن کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قرآن کریم اور سیرت نبوی کا کوئی گوشہ مبہم نہیں رہتا۔ اور اسلام کا روشن چہرہ بغیر کسی تاویل کے سامنے آجاتا ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ ر)

۵۔ مشکلات قرآن کا انقلابی حل:۔ عدم ترتیب قرآن کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کا حل خود قرآن سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت۔

۶۔ "اعلان انقلاب" یعنی مفہوم سورۃ العلق:۔ حقیقی فاتحۃ القرآن کا انقلابی پیغام "اعلان انقلاب" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں عالمی فلسفۂ تخلیق و علم سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کا یہ پہلا پیغام ہی اساس کتاب اللہ اور اسلام ہے۔ قیمت

۷۔ پیمان انقلاب۔ یعنی مفہوم سورۃ الحمد:۔ کو ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اور امام ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمہ کے علاوہ ہندوستان کے مترجمین کے چھبیس ہندی اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ اس رسالے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ترتیب تنزیلی کو پیش نظر رکھا جائے تو اسلام کا انقلابی پیغام نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

تمہید

بسمہ سبحانہ

"لیس للانسان الا ما سعی"

(جو بوؤ گے وہ کاٹو گے)

انقلاب کی ابتدا انقلاب فکر سے ہوتی ہے اور معاشی و معاشرتی انقلاب اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ انقلاب تقلید کے بندھنوں کو توڑ کر بجبر اندھوں کو کوئیں میں گرنے سے روکتا ہے اور ترقی اور تجدید کی راہ دکھاتا ہے۔ قرآنی یا کتابی انقلاب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کتاب و حکمت کی روشنی میں تجدید کو بے راہ روی سے نہ صرف بچاتا ہے بلکہ تخریب کو بھی تعمیر بنا دیتا ہے۔

قرآن حکیم نہ صرف پیغام انقلاب ہے بلکہ ذہنی اور معاشرتی انقلاب لانے کے مدارج بھی بتاتا ہے جس طرح نباتات و حیوانات کے نشو و نما کے سلسلے میں عمر و ماحول کے اعتبار سے ان کی زندگی کے قوانین جلب منفعت و رفع مضرت بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح معاشرۂ انسانی کی زندگی میں قوانین حیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انفرادی زندگی کے قوانین اجتماعی زندگی کے قوانین سے الگ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں تضاد نہیں ہوتا۔ اسی طرح بچپن۔ طفولیت، نوجوانی، جوانی، کہولت اور بڑھاپے میں غذا اور تحفظ جسم کے قوانین اگرچہ اپنی نوعیت بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اصولی حیثیت سے ان سب کا مقصد جسمانی صحت کی ترقی ہوتی ہے۔

معاشرۂ انسانی میں وہ کون سے امراض پیدا ہو گئے تھے جنھیں قرآن منقلب کر کے فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے پس منظر اسلام کا جاننا ضروری ہے۔ قرآن نے ایسا انقلاب لانے کا کیا طریقہ بتایا وہ قرآن کو تاریخی ترتیب ہی سے پڑھنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن کو سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب سے پڑھئے۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قرآن کے مخاطب ان انقلابی تعلیمات کو کس طرح سمجھتے تھے، ان اقوام کے افکار و اعمال کا قرآن کے ساتھ ساتھ مطالعہ کیجئے۔ اس طرح آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ قرآن "بیان" للناس" ہے۔ اور قرآن کریم یقیناً فہم و عمل انسانی کے لئے بہت ہی واضح اور آسان ہے۔

لیکن قرآن کو رسولؐ عربی کے زمانے کے منکروں نے ہی مبہم نہیں بنایا تھا، بعد میں پیدا ہونے والے مُفسّرین بالرائے نے تو اسے بالکل مبہم بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ عربی زبان کو خدا کی زبان قرار دیتے تھے۔ انھوں ہی نے قرآن کی اکثر آیتوں کو مشتبہ المراد بنا دیا۔ حرُوف مقطعات اور بعض روحانی تصورات کے متعلق بھی یہی بتایا کہ ان کا مفہوم اللہ ہی سمجھے۔ عربی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد فارسی تفوق کے زمانے میں بخارا، غزنین اور دہلی نے جو خدماتِ اسلام کیں۔ ان میں سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ آرین تصورات کو عربی تصورات کے ساتھ قرآنی جامۂ انقلاب پہنا دیا۔ اور مثنوی رومیؒ کو قرآن فارسی کا لقب ملا۔ آخر کار امام ولی اللہؒ دہلوی کے خاندان نے اردو کو بھی یہ شرف بخشا کہ وہ خدائی وحی کو بیان کر سکے۔

یاد رکھیئے کہ خدا کی کوئی خاص زبان نہیں۔ اس لئے خدا نے ہر قوم میں اسلامی تعلیمات اسی قوم کی زبان میں، اور اُسی قوم کے انسان کے ذریعے بھیجی ہیں۔ اس لئے ہم ہر زبان کو خدائی زبان مانتے ہیں۔ اور پیغام ربانی لانے کی حیثیت سے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔

(

ضرورت ہے کہ قرآن اور دیگر کتبِ ربانی کے ترجمے دُنیا کی ہر زبان میں ہوں تاکہ حکمتِ الٰہیہ کو ہر شخص سمجھ کر اسلامی انقلاب میں شریک ہو سکے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ مفکرینِ قرآن پر عمل کرنے سے پہلے اس کو پورے طور پر سمجھ لیں۔ اور ان مفکرین سے قطعی اعراض کریں جو قرآن کو صرف پڑھنے پڑھانے کی چیز سمجھتے ہیں، اور اس کے بتائے ہوئے طریقِ انقلاب کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کرتے۔

قرآن و سیرت کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ دُنیا اوہام میں پھنسی ہوئی تھی۔ پروہت اور ساحر انسانی عقول کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے اور معجزات و کرامات کے فریب میں پھنسا کر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے مارا کرتے تھے۔ اس قدامت پرستانہ عقل فروشی کو قرآنی تعلیم انقلاب نے قطعی ختم کر دیا۔ اس نے بار بار اور صاف صاف کہہ دیا کہ خدا نے رسولؐ عربی کو کوئی معجزہ نہیں دیا اور آنحضرت نے اپنے انقلابی طریقۂ کار سے یہ ثابت کر دیا کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" یعنی انسان اپنے عمل ہی سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا

ہے۔ اور پروہتوں اور ولیوں کے معجزات اور کرامات پر بھروسہ کرنا شرک کے مترادف ہے
جب ان شعار کے فریب سے مسلمان نکل گئے تو پکے موحد بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا پر کامل بھروسہ
کرنے کی وجہ سے ان میں انتہائی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی وہ پروہتوں کو چھوڑ کر اپنے بھروسے
پر اور اللہ پر توکل کر کے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جاں فروش بن گئے۔ یہ ذہنی اور روحانی انقلاب
تھا، جو قرآنی تعلیم نے دنیا میں پیدا کیا۔

اسی انقلاب کا یہ اثر ہے کہ باوجود ارتجاعیوں اور قدامت پرستوں کی کوششوں کے
دُنیا میں حق پرستی باقی ہے۔ اور انشاء اللہ عالمگیر بن کر رہے گی۔ یعنی ذہنی انقلاب کی بنیادوں پر جو
کتابی آمریت قائم ہوگی اس میں مادیت بھی روحانیت بن جائے گی۔

جو نا مسلمان عربی نہیں جانتے، وہ چاہتے ہیں کہ قرآن کی محیر العقول انقلابی تعلیم کو اپنی اپنی زبانوں
میں سمجھیں۔ خود مسلمان نوجوان بھی قرآن کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ اس کی مادری زبان
میں پیش کیا جاوے۔ اس لئے ہم عربی ممالک کے اہل علم حضرات سے اور دوسرے ممالک کے
عربی داں طلباء سے درخواست کریں گے کہ وہ قرآن کے انقلابی پیغام کو مختلف ملکوں کی زبانوں میں
عام کر دیں۔ تاکہ دُنیا میں امن و ترقی کے راستے اس نہج پر کھل سکیں جسے آج سے تیرہ سو سال
پہلے رسول عربیؐ نے تدریجاً کھولے تھے۔ اور جس میں اولی الامر کو اختیار تھا کہ ماحول کے اعتبار
سے قرآنی انقلاب کے قوانین عدل و مساوات و ترقی کو معاشرۂ انسانی میں حسب ضرورت
جگہ دیتے رہیں۔

محمد اجمل خاں

بیت الحکمہ۔ دہلی (ہند)
دوشنبہ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء

قرآن اور انقلاب

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

۱۔ قرآن و سیرت :-

قرآن نہ صرف قدیم کتب الٰہیہ کو ہدایت و نور قرار دیتا ہے، اور اُن کے لانے والوں کو خدائی پیغام لانے والا بتاتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ قرآن حکیم میں آدمؑ سے اب تک جتنے انبیاء و حکما گزرے ہیں اُن کی جملہ تعلیم کا الہامی کتاب میں تذکرہ ہے۔ چونکہ اس میں مدتسوں اور پروہتوں کی خود ساختہ تعلیمات کی تردید بھی موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ جس قوم کی طرف قرآن کا روئے سخن ہو اُس کی پوری تاریخ پیش نظر رکھیں۔

سیرت نبویؐ اس اسلام کی تاریخ ہے جس کو رسول عربیؐ نے قرآنی وحی اور کتب الٰہیہ کی روشنی میں نئے سرے سے قائم کیا ہے۔ مقصدِ دعوت تو قدیم ہی ہے لیکن طریق کار جدید ہے۔ اس عمل نبویؐ کے سلسلے میں قرآن کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں بذریعہ وحی آپؐ کے قلب پر نازل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ وحیاں غیر متلو کہلاتی ہیں۔ اور ان کا درجہ بھی وہی ہے جو دیگر کتب و حکم الٰہیہ کا ہے۔ یہ بھی قرآن سے ماخوذ ہیں۔

قرآن اور دیگر کتب الٰہیہ :-

ہم جملہ کتب الٰہیہ قبل قرآن کو احادیث و سنن نبویؐ کا درجہ دیتے ہیں اور جرح و تعدیل کے بعد سنت نبوی کی طرح ہر کتاب اللہ کی تصدیق کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ خود قرآن بار بار یہی کہتا ہے کہ قرآن مصدق ہے کتب اوّلین کا۔

عبداللہؓ بن سلام یہودی عالم تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی برابر توراۃ پڑھتے رہے رسول اللہ کی اجازت تھی کہ ایک رات قرآن کی اور دوسری رات توراۃ کی تلاوت کیا کریں۔ (ذہبی تذکرۃ حفاظ)

قرآن اور دوسری قوم کے ہادی و رہنما:- قرآن تسلیم کرتا ہے کہ ہر قوم میں اُن کی زبانوں میں ہدایت کرنے والے یہی بتانے آتے رہے ہیں کہ اللہ کے بندے بنو اور شیطان سے دور بھاگو (اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت) اس لئے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ملک و قوم میں اللہ کا راستہ بتانے والے آتے رہے ہیں۔ (لکل قوم ھاد) ان من اُمّۃ الا خلا فیھا نذیر) (الفاطر ع ۲)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ خدا پرستی کا پیغام دُنیا کو دیتے رہے ہیں وہ پیام کی نوعیت کے اعتبار سے سب برابر ہیں (لا نفرق بین احد من رسلہ) البتہ بعض کو پیغام پہنچانے میں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لیے انھیں ذاتی مجاہدہ وجہاد میں دوسروں پر فضیلت دی گئی۔

قرآن یعنی عالمی انقلاب کا پروگرام:- "مسلمان قرآن حکیم کو انسانیت کیلئے آخری پیام ربانی مانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس عقیدے کو آج کی ذہنیت سے قریب لانے کے لئے قرآن دنیا کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام دیتا ہے۔" (مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پیش لفظ ترتیب نزول قرآن کریم۔ از مؤلف)

نصب العین:- "اس طرح مطالعہ کرنے والے کی فکری ضرورت کا خیال رکھا جائے تو سب سے پہلے اس تحریک کا نصب العین مقرر ہونا چاہیئے۔ جسے ہم ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلّہ میں مضمر دیکھتے ہیں (ناظرین سے ہم سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس آیت کی تفسیر 'ازالۃ الخفاء' کی جلد اوّل کے ابتدائی صفحات میں ضرور مطالعہ کریں)" (مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پیش لفظ ترتیب نزول قرآن کریم)

قرآن کا مقصد:- "قرآن کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کا حکم چلانے والی طاقتور حکومت پیدا کی جائے۔" (امالی عبیدیہ۔ ج ۴۔ ص ۲۲۳۷)

"قرآن ایک نور ہے جو دنیا سے ظلم (اندھیرا) دور کرنے آیا ہے۔ مگر اس کی برکت سے ظلمت کب دور ہوگی، یہ اللہ ہی جانتا ہے .... جب تک نور و ظلمت موجود ہیں اس وقت تک مسلمانوں (اہل کتاب۔ مؤلف) کا فرض ہے کہ وہ اس نور کو ظلمت پر غالب کرنے کی کوشش (جہاد) کرتے رہیں" (امالی مولانا عبیداللہ۔ ج ۴۔ ص ۲۲۳۲)

جمہوریت (ری پبلک) یعنی کتابی آمریت :- جمہوریت اس طرزِ حکومت کو کہتے ہیں جس میں کسی تصور کے ماتحت حکومت چلائی جائے۔ یعنی اس میں کسی تصور یا نصب العین کی آمریت ہو۔ اسلامی جمہوریت میں قرآن و عمل نبوی کی پابندی لازمی ہے۔ چونکہ قرآن حکیم دیگر کتب الٰہیہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلامی جمہوریت کو کتابی آمریت کہنا زیادہ موزوں ہے، یا یوں کہا جائے کہ قرآن ایک کتابی پارٹی ڈکٹیٹرشپ کے ماتحت جمہوریت قائم کرنا بتاتا ہے۔

عوامی شورائیت (ڈیموکریسی) وہ پنچائتی حکومت جس میں سلطنت کا نام کاروبار عوام کی کثرتِ رائے سے طے پاتا ہے اُسے عوامی آمریت یا مجارٹی کی آمریت کہنا چاہیئے۔ اس طرزِ حکومت میں کثرت آراء سے جو بات طے ہو وہی حق سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر حزبِ مخالف کا غلبہ ہو جائے تو وہ ناحق کو حق منوا دیتا ہے۔ یعنی اصول کی جگہ کثرت آرائے انسانی کا فیصلہ ہی نافذ ہوتا ہے۔ قرآن کتابی شورائیت کی تعلیم دیتا ہے (یعنی ڈیماکریٹک ری پبلک)

علم و کتاب :- قرآن نے علم و کتاب کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ علم ہے جو خدا ہمارے حواس اور شعور کے ذریعے دیتا ہے۔ یہ علم پوشیدہ نہیں رکھا جاتا بلکہ عام کیا جاتا ہے۔ یہ نور ہے۔

سحر و کہانت :- دوسرا علم وہ ہے جو شیطان دیتا ہے اور جسے کاہن و ساحر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ ظلمت ہے۔

انقلاب :- وہ طریقِ فکر و عمل ہے جس کے ذریعے انبیاء نے شرک ظلمت سے

نکال کر انسانی ذہن و روح کو نور سے روشناس کیا اور فکر انسانی میں یقین کی روشنی پیدا کی۔

اسلام کی نئی ترجمانی:- موجودہ عہد سائنٹیفک عہد ہے۔ اس عہد تک پہنچنے میں قرآن کی تعلیم کو بہت دخل ہے۔ چونکہ العوام کالانعام بل ہم اضل ہیں۔ اسی لئے اسلامی تعلیم کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ ہر مسلم و مسلمہ کے لئے علم و شعور حاصل کرنا ضروری ہے۔ ظلمت سے نکالنے کے بعد جمہوریت کے لئے مرکزی تعلیم پھیلانے والی جماعت ضروری ہے۔ اسے قرآن نے حزب اللہ کہا ہے۔

انسان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دنیا کو امن و ترقی کے راستے پر ڈالنے اور دنیا والوں کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لئے معاشی، معاشرتی اور روحانی مشکلات کا حل سوچیں۔ مسلم یعنی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے ہر قوم کے بندگانِ خدا کا فرض ہے کہ وہ علمی مفکرین کی ایسی جماعت تیار کریں جو دنیا والوں کو افراط و تفریط سے بچا سکیں اور ایک ایسا عالمی نظام معاشرت پیدا کر سکیں جس میں ہر انسان نیک عملی اور ترقی پر خوش دلی سے "مجبور" ہو۔ ہندوستان میں حجۃ اللہ علی الارض شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب الٰہیہ اور سنت انبیاء کی حکمت کو سوسائٹی کے اونچے طبقے کے لئے پیش کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس فکر کو ہند کے عام لوگوں تک پہنچایا اور امیر المومنین سید احمد رائے بریلوی نے اس فکر کو عملی جامہ پہنایا۔ غرضیکہ دنیا میں مختلف ملکوں میں یہ انقلابی تحریک کسی نہ کسی شکل میں پہنچتی رہی۔ ہمارے زمانے میں مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۸۷۲-۱۹۴۴) نے کتابی انقلاب کو تاریخ اسلام کے مثالی دور سے مستنبط کر کے عہدِ حاضر کی زبان میں پیش کیا۔ بحمد اللہ ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد بانیان "حزب اللہ" میں سے موجود ہیں۔ اور ان کے چند ساتھی بھی زندہ ہیں جو دنیا کو امن و ترقی اور روحانیت کی طرف لے جانے میں عملی جد و جہد میں مصروف ہیں۔

عالمی انقلاب (فرد اور قوم):- جماعتی ترقی فرد کی ترقی ہی سے ہو سکتی ہے اس لئے وہی نظامِ جماعت بہتر ہوتا ہے جو فرد کی فطری استعدادوں کو ترقی کی راہ پر لگائے۔ اور فرد و جماعت میں تضاد نہ

ہو۔ لیکن کوئی جماعت یا قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ ایسی قوموں میں گھری ہوئی ہو جو جاہل و بے شعور ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ قطرے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے قطروں سے گھرا ہوا ہو جو طاہر و پاک ہوں۔ ورنہ وہ خود بھی گندہ اور نجس ہو جائیگا اسی لئے قومی انقلاب و ترقی کا ہمیشہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ اپنے نفع کے لئے عالمی انقلاب یا طہارت کی کوشش کی جائے۔

دوسرے لفظوں میں اسلام انفرادی یا قومی اصلاح و ترقی کا نام نہیں۔ نہ چند اخلاقی و سیاسی اصولوں کا نام ہے۔ بلکہ وہ ایسی قوم تیار کر دیتا ہے جس میں ایسا معاشی نظام جاری ہو جو افراد کو بد اخلاقی و بے دینی سے روکے اور اسے نیک عمل بنا دے۔ اس معاشرہ، سلطنت یا قوم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس انقلاب کو عالمی بنائے۔ اور خود اپنی جماعت سے ایسے افراد کو جو منکر مساوات و ترقی ہوں چھانٹتا رہے۔

یہ اللہ والے انقلابی پہلے اپنی ایک مرکزی جماعت بناتے ہیں۔ اس پارٹی یا جماعت کے اندر شوریٰ یعنی جمہوری نظام جاری ہوتا ہے اور اس کا طرزِ عمل کتاب اللہ کی روشنی میں آمرانہ ہوتا ہے جب تک کہ پوری جماعت تعلیم و تربیت پاکر (جیسا کہ بیعت رضوان ۶ھ کے بعد ہوا) حق پرست نہ بن جائے۔ اس وقت قومی جمہوریت قائم ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ عالمی جمہوریت کی کتابی علمبردار بن کر، بین الملی جمہوریت ترتیب دیتی ہے۔

حزب اللہ یا مرکزی انقلابی پارٹی:۔ "انقلاب کے لئے ایک مرکزی جماعت مفکرین کی تشکیل ضروری ہوتی ہے۔ اور جب یہ جماعت اس پروگرام کو چلانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے تو اسے ہر نشیب و فراز میں مناسب تبدیلی کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں۔ "السابقون الاولون من المہاجرین والانصار، والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ" میں اسی جماعت کا اثبات مقصود ہے" (مولانا عبید اللہؒ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

"جن لوگوں کو المہاجرین کا لقب دیا گیا ہے وہ تو مکہ کے رہنے والے تھے۔

آپ تعجب کریں گے کہ مکّہ کے الانصار بھی مکی زمانے میں ہی تیار ہوئے۔ انھیں دو عنصروں سے مستقل مرکزی جماعت بن سکی۔ جس نے مدینہ میں اسلامی حکومت پیدا کر دی۔"

(مولانا عبید اللہ رح۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

یہ انقلابی پارٹی انقلابی طریق کار پر عمل کر کے اپنا سیاسی غلبہ (آمریت۔ ڈکٹیٹر شپ) قائم کر لیتی ہے۔ لیکن یہ ڈکٹیٹر شپ کتب الٰہیہ کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے بعد ملک کی اقتصادیات پر قبضہ کر لینے کے بعد انسانی معاشرہ کو بجبر علم و دولت کے ذریعوں پر قابض کراتی ہے۔

حزب اللہ کا پارٹی پروگرام:- "قرآن کی متعدد سورتوں میں حزب اللہ کے لیے ایک پارٹی پروگرام تفصیلی احکام دے کر مکمل کر دیا گیا ہے۔" (مولانا عبید اللہ رح۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

ہم نے قرآن حکیم کو سیرت نبوی کے دس ادوار کے ساتھ ساتھ مرتب کر کے۔ "سیرت قرآنیہ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں ابتدائے بعثت سے وفات نبوی تک کا پورا پروگرام موجود ہے، جو نصب العین کی روشنی میں مختلف اقوام اور مختلف حالات میں بدلتا رہا۔ لیکن خود نصب العین نہیں بدلا۔

انقلاب کیا ہے؟ "غلام کماتا ہے تو اس کی کمائی آقا کی ملکیت بن جاتی ہے خود اس کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہے۔ قیدی بھی جیل کے اندر کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ وہ جب تک جیل میں ہے ایک قسم کا غلام ہے۔

جب کسی سے کہہ دیا جائے کہ "یہ چیز تیری ہے" تو اس کے فکر میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اب وہ اپنی ملکیت کی حفاظت کرتا ہے۔ اور ضرورت پڑے تو اس کے لئے جان تک دے سکتا ہے۔ اس تبدیلی کا نام انقلاب ہے" (امالئی عبیدیہ۔ ص ۲۰۳)

خلاصہ یہ کہ ذہنی انقلاب کے بعد اقتصادی انقلاب و جوش عمل پیدا ہونا لازمی ہے (دیکھئے سیرت قرآنیہ مکیہ از مؤلف)

فاروق اعظم کے فیصلے کے مطابق سرمایہ پرستی کا قطعی استیصال اور ذرائع پیدادار

پر قومی قبضہ انقلاب کی پہلی شرط ہے۔

انقلابی سوسائٹی :- "مرکزی پارٹی کے مفکرین کو دوسرے مرحلے میں ایسی سوسائٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو تمام انقلابی نظریات پر حاوی ہو۔ اس سوسائٹی کے کارکن جس وقت موقع دیکھتے ہیں انقلابی گورنمنٹ قائم کر لیتے ہیں۔ جو پرانی حکومتوں کو توڑتی اور اپنے پروگرام پر نئی حکومت پیدا کرتی ہے۔ اسلامی عقائد و اخلاق (یعنی تعلیمات قرآن قبل ہجرت) اور اسلامی حکومت (بعد بیعت رضوان) کی درمیانی کڑی اسی انقلابی سوسائٹی والے (یعنی موت پر بیعت کرنے والے رضوانی) ہوتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے احکام مشتبہ رہنے سے تسلسل فکر قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق سمجھنا ضروری ہے۔" (مولانا سندھیؒ۔ پیش لفظ۔ ترتیب نزول قرآن کریم)

موت پر بیعت | اے رسول جو تجھ سے موت کی بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ (قرآن)

بیعت رضوان کرنے والوں نے ۶ھ میں آنحضرتؐ کے ہاتھ پر موت پر بیعت کی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ فتح خیبر، فتح مکہ، فتح حنین اور پھر فتح عالم ہوئی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے وفات نبویؐ کے چند سال بعد شہنشاہ ایران کو اسی بناء پر دریائے فرات کے کنارے سے لکھا تھا کہ "اگر تو اسلام نہیں لاتا، یا اطاعت پر تیار نہیں ہے تو یاد رکھ کہ میں ایسی فوج کے ساتھ آ رہا ہوں جو موت کو اتنا ہی عزیز رکھتی ہے جتنا کہ تو زندگی کو" (پیام خالدؓ ۶۳۳ء)

قرآنی جبر یا ڈکٹیٹر شپ :- "غلامی جب طبیعتوں کی عادت ہو جائے تو انھیں جبراً آزادی دینا پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ربا کو بھی بجبر بند کر دیا جائے، یہ دو قانون، سرمایہ داری ختم کرنے کے لئے کافی ہیں یہ ہے اسلام کا انقلاب جسے امام ولی اللہ کا فلسفہ اپنی اساس قرار دیتا ہے۔"

(امالی مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ ج ۴۔ ص ۱۸۷۵)

نبی کا کام :- نبی کو اللہ کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ وہ اجتماع انسانی میں ایسا دستور زندگی رائج کرتا ہے جس سے انسان ترقی کی راہیں تیزی سے طے کرنے لگتا ہے۔

رسولِ عربی کی بعثت کی غرض:- بقول امام ولی اللہ العمری دہلوی (۱۷۰۳ - ۱۷۶۳) آنحضرت کے مبعوث ہونے کی غرض یہ تھی کہ دُنیا میں ان تمام ظالمانہ نظاموں کے خلاف جہاد کریں جو انسانی معاشرہ کو بربادی کی طرف لے جاتے ہیں ؟ (امام ولی اللہ رح کارل مارکس سے سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے)

آنحضرت نے اسی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مجاہدوں کی وہ جماعت تیار کی تھی جو حزب اللہ کے نام سے موسوم ہوئی ۔ اور جس نے حزب الشیطان کو صراطِ مستقیم پر لانے اور دنیا میں عدل و قسط کے قیام کے لئے ہر ممکن جہاد کیا ۔

قرآنی انقلاب کی منزلیں جب دولت ایک چھوٹے سے طبقے میں محدود ہو جاتی ہے تو معاشی بدحالی کی وجہ سے انسان کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شیطانی طریقوں سے زندہ رہنے کے منصوبے تیار کرنے لگتا ہے (کاد الفقر ان یکون کفرا) لہٰذا تاریخ امم کی روشنی میں آنحضرت نے نوع انسانی کو تنگدستی و معاشی بدحالی سے نکلنے کی صراطِ مستقیم دکھائی ۔ نعمت الٰہیہ (عزت یعنی حُرّیتِ ذہن و معاش ، اور قیام دولت کتابیہ) کے لئے انقلاب کا نصب العین خدا پرستی کو قرار دیا حصول نصب العین کے لئے ۔

۱ - پہلے دعوت سراً دی ۔ یعنی خواص کی ایک مرکزی خفیہ پارٹی بنائی ۔

۲ - پھر دعوت جہراً دی ۔ یعنی انقلابی پروگرام کو قریش کے سامنے رکھا جس میں کہ تکذیب و استہزا کا پامردی سے مقابلہ کیا گیا ۔

۳ - اس کے بعد نصاریٰ کو دعوت اتحاد دی ۔ اور ہجرت حبشہ کی گئی ۔

۴ - قبائل حول المکہ کو انقلابی پیغام پہنچایا (بعد شعب ابی طالب)

۵ - بنو اسرائیل مدینہ کو دعوت دی گئی اور اوس و خزرج میں سے انقلابی پیدا کئے گئے ۔ (بعد شعب ابی طالب)

۶ - ہجرت مدینہ کے بعد مرکز انقلاب مدینہ قرار پایا ۔ اور آنحضرت مہاجرین و انصار اور یہود کے امیر بن گئے ۔

۷ - ۶ھ میں بیعت رضوان کے بعد ایک ایسی قومی جماعت تیار ہو گئی جو عالمی انقلاب

کے لئے مرنے پر بیعت کرچکی تھی۔

۸۔ فتح مکہ کے بعد عالمی پروگرام پر تیزی سے عمل ہونے لگا۔ اور پھر جیش اسامہؓ تیار ہوا۔

۹۔ پھر وفاتِ نبوی کے بعد رفقائے رسولؐ نے دولتِ کتابیہ کو بہت وسعت دی۔

مندرجہ نکات سیرتِ نبوی کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہیں

ابتدائے تمدن سے دین و اخلاق کا انسانی معیشت و معاشرت سے گہرا تعلق رہا ہے لیکن خود غرض پروہتوں، کاہنوں اور نام نہاد طبیبوں نے اپنی معلومات کو راز میں رکھنا مفید سمجھا۔ اور بادشاہوں یا سرداروں اور مالداروں کے نفع کے لئے قانون سازی شروع کی جانوروں اور انسانوں کی قربانی سے اچھے اور بڑے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے طریقے رائج کئے۔ اسی طرح اپنی قوم کو ذہنی غلام اور اجنبی قوم کو جنگ کے ذریعے جسمانی غلام بنانے لگے۔ پھر اپنی ہی قوم کی عورتوں کو مذہب کے ذریعے اور مردوں کو سود کے ذریعے غلام بنانے کے قانون بنانے لگے۔ اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں، اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے لگے۔ تاکہ مساوات و محبت کا پیغام عوام تک نہ پہنچے۔

اس پس منظر میں رسول کریمؐ کی سیرت میں مندرجہ ذیل واقعات سے آپ اسلامی انقلاب کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔

سنہ ۱ محمدی	سنہ ۵۷۰ مسیحی	پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیمی کے مدرسہ میں تعلیم سے خود اعتمادی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔
سنہ ۱۲ ,,	سنہ ۵۸۲ ,,	سفرِ شام میں نصرانی تمدن اور راہبوں کی خوش اخلاقی سامنے آتی ہے۔
سنہ ۲۵ تا سنہ ۴۰ محمدی	سنہ ۵۹۵ تا سنہ ۶۱۰ مسیحی	پندرہ سال تک کل عرب اور اقوام کا تجارتی

		سفروں میں مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مالدار پروہت اور امیر ہر جگہ ظالم اور تنگ نظر ہیں وہ علم اور دولت کو عام نہیں کرنا چاہتے۔
۴۱ سنہ محمدی	۶۱۰ سنہ مسیحی	صرف ایک رحیم آقا کو مان کر علم وعقل کو عام کر لے، اور دولت کو صرف پروہتوں اور رئیسوں تک محدود نہ رکھنے کے لئے خفیہ سوسائٹی کی تاسیس۔ (نبوت اور انذار کی ابتدا)
۴۵ سنہ محمدی	۶۱۵ء	ہجرت حبشہ۔ رحمانان پرست نصرانیوں سے دوستی ہوتی ہے۔
۵۳ سنہ محمدی	۶۲۳ء	سورہ بنو اسرائیل کے خواب اور ہجرت مدینہ کے بعد کتابی آمریت کے قیام کے لئے یہود سے دوستانہ معاہدہ ہوتا ہے۔ نماز فرض ہوتی ہے۔ تعمیر مسجد اللہ
۵۹ سنہ محمدی	۶۲۹ء	قریش، اخبار یہود اور منافقین مدینہ کی شرارتوں کے باوجود حدیبیہ میں انقلابی کتابی جماعت کی پیدائش و قیام۔
۶۳ سنہ محمدی	۶۲۳ء	حج اکبر میں آزادی عقل و ضمیر، آزادی زن و غلام و مسکین کا اعلان، اور ایسی کتابی آمریت کا قیام جو جمہور کو مجبور آزاد اور مالدار بنا دے اور عقلی بنیادوں پر کہانت و پروہتی کو ختم کر کے اصولی یعنی جمہوری یا کتابی آمریت پر عمل کرے۔

ترتیبِ نزول قرآن کے بغیر قرآن و سیرتِ نبوی عسیر الفہم بن گئے ہیں

ہرکس کہ نداند و بداند کہ بداند
درجہل مرکب ابد الدہر بماند

قرآن حکیم ۱ھ نبوی سے ۲۳ھ نبوی تک رسول عربی صلعم کے قلب پر معناً نازل ہوتا رہا۔ اور رسول کریمؐ اس کے احکام و دلائل (آیات) کو مختلف قوموں تک پہنچاتے رہے۔ قرآن کریم کے مختلف ادوار کو تاریخی ترتیب سے پڑھا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے لئے آپ نذیر و منذر تھے۔ یعنی یوم البعث کی سزا اور موجودہ دنیا کے عذاب سے خبردار کرتے تھے۔ اس کے بعد قرآن نے آپ کو بشیر و مبشر کا لقب دیا۔ جو نصرانی قوموں میں مسیح کے لئے رائج تھا۔ اسی دور میں "رحمان" و نصرانیت کا ذکر زیادہ ہے یعنی روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے۔ شعب ابوطالب سے ۱۰ھ نبوی میں نکلنے کے بعد آپ کا روئے سخن بنو اسرائیل اور مجوس وغیرہ کی طرف زیادہ ہے۔ اور اسی زمانے سے رویائے اسرا کا تعلق ہے۔ اور سیروا فی الارض پر زور ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہجرت کرنا چاہیئے۔

ہجرت مدینہ کے بعد مختلف غزوات کے اشارات اور معاشرتی زندگی کے احکام پائے جاتے ہیں۔ ان کی ترتیب بھی علماء کو معلوم ہے۔

موجودہ مصحف میں حضرت زیدؓ بن ثابت نے صحابہ سے مشورے کے بعد جو ترتیب سور قائم کی ہے اُس میں قرآن کو تاریخی ترتیب سے درج نہیں کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے قرآن کو تاریخی ترتیب سے مدون کیا تھا۔ اور اکثر مہاجرین چونکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے وہ قرآن کی تاریخی ترتیب سے واقف تھے۔ انھوں نے مدینہ والوں کو بھی بتایا تھا کہ مکہ میں قرآنی تعلیم یہ تھی۔ ان میں سب سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر آنحضرتؐ کے رسول بن کر مدینہ آئے تھے اور انھوں نے

اوس وخزرج کو گھر گھر جا کر مکی قرآن کی تعلیم دی تھی۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد رسول اللہ پر جو قرآن نازل ہوا، وہ ایسا تھا کہ اُس کے بعض احکام مکی سورتوں میں نہ تھے۔ اس لئے جب قتال فرض ہوئی، یا دوسرے احکام زکوٰۃ وحلال وحرام نازل ہوئے تو وہ مکی سورتوں میں بھی حسب موقع بڑھائے گئے یہ آیات سب صحابیوں کو معلوم تھیں۔ اور ہمارے پاس کافی روشنی موجود ہے جس سے ہم مکی اور مدنی آیتوں کو الگ کر لیتے ہیں۔

موجودہ مصحف عثمانی اُن صحابیوں یا تابعین کے لئے تو نہایت موزوں تھا جو خود اُس کش مکش سے گزر چکے تھے، جس میں سے آنحضرت اور اُن کے رفقاء گزرے تھے لہذا وہ جس ترتیب سے بھی قرآن پڑھتے پڑھ سکتے تھے۔ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود کی ترتیب، حضرت اُبی بن کعب کی ترتیب سے مختلف تھی صحابیوں کے پاس مختلف ترتیبوں سے قرآن موجود تھا۔ یہی حال رسول اللہ صلعم کی وفات کے بیس سال بعد تک رہا۔

آذربائجان کی لڑائی میں اختلاف ترتیب کی وجہ سے مسلمانوں میں جھگڑا پڑا، تو حضرت عثمانؓ نے سورتوں (اور سورتوں میں رکوعوں) کی ترتیب مقرر کرادی۔ اور یہ خیال رکھا کہ پہلے لمبی سورتیں ہوں، پھر مئین یا سو آیتوں والی اور ان کے بعد مفصل یا مختصر سورتیں لکھی جائیں۔ اس ترتیب کو سرکاری طور پر رائج کر دیا گیا، اگرچہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کو اس سے اختلاف رہا اور وہ اپنی ہی ترتیب قرأت پہ قائم رہے اور لوگوں کو پڑھاتے رہے۔

ہمارے لئے، یا ان لوگوں کے لئے جو اسلام کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنا چاہتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ترتیب نزول قرآن کے ساتھ ساتھ آنحضرت کی عملی زندگی سامنے آئے۔ اس لئے اسلام کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے مصحف عثمانی کی ترتیب قرآن وسیرت کو عسیر الفہم بنا دیتی ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں سیکڑوں فرقے پیدا ہو گئے ہیں، اور اصل تعلیم اسلام مفقود ہو گئی ہے۔

ترتیب آیات فی السُّوَر: یہ تو امر مسلّمہ ہے کہ مختلف آیات و الفاظ کو رسول اللہؐ نے حکم الٰہی سے مختلف سورتوں کے اندر بعد میں بڑھائے اکثر مکی سورتوں میں قتال و زکوٰۃ کے متعلق جو احکام بڑھائے گئے ہیں، وہ اسی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً سورۃ المزمل میں پہلے قتال کا ذکر نہ تھا یہ سورہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس کے بارہ سال بعد ۲ھ میں جب قتال فرض ہوا تو ترتیب آیات فی السور میں رسول اللہؐ نے قتال و زکوٰۃ کا ذکر اس طرح بڑھایا: ان ربك یعلم انك تقوم ادنی من ثلثی اللیل نصفه وثلثه وطائفة من الذین معك ط والله یقدر اللیل والنهار ط علم ان لن تحصوه فتاب علیکم فاقرأو ما تیسر من القرآن ط علم ان سیکون منکم مرضی و اخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل الله (واخرون یقاتلون فی سبیل الله) فاقرأوا ما تیسر منه واقیموا الصلوٰة (واٰتوا الزکوٰة واقرضوا الله قرضاً حسناً)...........○

اسی طرح سورۃ الاعلیٰ میں سنقرئك فلا تنسی کے بعد (الا ما شاء الله) بعد میں بڑھایا گیا۔ تاریخ و احادیث سے یہ سب آیتیں معلوم ہو سکتی ہیں اس سے ثابت ہے کہ سورتوں میں نظم آیات قرآنیہ رسول نے دی ہے۔ اس کے علاوہ تلك الغرانیق العلی کی بحث کے سلسلے میں بھی جو آیت رسول اللہؐ نے (خدا کے حکم سے) اجمال کی تفصیل کے لئے بڑھائی ہے وہ بہت بعد کی ہے۔ اگر آپ اس سورہ کی مختصر آیتوں اور ردی پر نظر ڈالیں گے، اور پھر تشریحی آیت کو دیکھیں گے تو یہ مسئلہ صاف ہو جائیگا (دیکھیئے سورہ والنجم)

افرأیتم اللّٰت والعزّی ○
ومنٰوة الثالثة الاُخری ○
الکم الذکر وله الاُنثی ○

تلک اذاً قسمۃٌ ضیزیٰ ہ

(ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم ما انزل اللہ بہا من سلطٰن ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس)

ولقد جاءھم من ربھم الھدیٰ ہ

اسی طرح جب بہت ہی ابتدائی سورت یعنی المدثر میں تسعۃ عشر کا لفظ آیا تو مستہزئین مذاق اُڑانے لگے کہ ہم ہزاروں ہیں، انیس فرشتے ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس پر جو تشریحی آیت نازل ہوئی ہے وہ بعد کے زمانے کی ہے اور ان مختصر آیتوں سے بالکل الگ معلوم ہوتی ہے جن میں ابتدائی مکی قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اصل میں علیہا تسعۃ عشر کے بعد و ما ھی ذکری للبشر تھا۔

آیات یہ ہیں :۔

سأصلیہ سقر ہ

وما ادرٰک ما سقر ہ

لا تبقی ولا تذر ہ

لوّاحۃٌ للبشر ہ

علیہا تسعۃ عشر ہ

(وما جعلنا اصحٰب النار الا ملئکۃً، وما جعلنا عدّتھم الا فتنۃ للذین کفروا، لیستیقن الذین اوتوا الکتٰب ویزداد الذین اٰمنوا ایماناً ولا یرتاب الذین اوتوا الکتٰب والمؤمنون ولیقول الذین فی قلوبھم مرضٌ والکافرون ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً ط کذالک یضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء ط وما یعلم جنود ربک الا ھو ط)

وما ھی الا ذکریٰ للبشر ہ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن ایک فرشتہ کے ذریعے سے قلب رسولؐ پر حسب ضرورت وحی ہوتا تھا۔ انہ لقول رسول کریم (سورۃ التکویر) وما صاحبکم بمجنون (یعنی رسول اللہؐ پر جن نہیں آتا جیسا کہ شاعروں اور ساحروں پر آتا ہے، بلکہ یہ قول فرشتہ کا ہے شیطان کا نہیں ہے۔ (وما ھو بقول شیطٰن رجیم) اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ ان ھو الا ذکرٌ للعٰلمین۔ (سورۃ التکویر)

اختلاف ترتیب سُوَر نہ کہ اختلاف تلفظ: بعض مفسرین بالرائے نے پورے قرآن کو مشتبہ قرار دینے کے لئے یہ کہا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں اختلاف قرأت سے مراد اختلاف تلفظ ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے۔ اور تلفظ قریش پر حضرت زیدؓ بن ثابت کو قرآن لکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو سوال یہ ہے کہ انھوں نے وہ قرآن کس تلفظ کے ساتھ لکھا تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں سرکاری طور پر دو دو شہادتوں کے بعد جمع ہوا تھا۔ اور وہ قرآنی نسخے کیا ہو گئے تھے جو مختلف کاتبوں کو رسول اللہؐ خود اپنی زبان مبارک سے لکھوا گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکڑوں حفاظ قرآن بھی موجود تھے اور "اوّل فالاوّل" کے اعتبار سے مہاجروں نے قرآن کو ترتیب نزول کے اعتبار سے بھی یاد کر رکھا تھا تحریر کا اتنا سوال ہی نہیں تھا کہ لفظوں اور اعراب کے جھگڑے شروع ہوتے خود رسول اللہؐ اور اجل قراء موجود تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وحی متلو کا تلفظ بدل جاتا اور لوگ یتامیٰ کو ایامی (وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامی) قصاص کو قصص (ولکم فی القصاص حیاۃ) عزت کو غرۃ (بل الذین کفروا فی عزۃ وشقاق ۳۸/۲) کہنے لگتے۔ یا یہ کس طرح ممکن تھا کہ حافظان قرآن اصل الفاظ قرآنیہ کی جگہ اُن الفاظ کا مفہوم یا مترادف لفظ پڑھنے یا کمی زیادتی کر دیتے۔ مثلاً وانذر عشیرتک الاقربین کے آگے

(ور هطلك منهم المخلصين) بڑھا دیتے۔ یا والیل اذا یغشی میں صرف (والذکر والانثی) پڑھتے اور (ما خلق) کو کم کر دیتے اور کہتے کہ یہ ابن مسعودؓ کی قرأت ہے یا تقدیم و تاخیر کر کے جاءت سکرۃ الموت بالحق کو (جاءت سکرۃ الحق بالموت) کر دیتے۔ اور والعھن المنفوش کی جگہ والصوف المنفوش پڑھنے لگتے۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی جدتیں اور تفسیر بالرائے کرنے والوں کی بنائی ہوئی مثالیں ہیں۔ بہرحال یہ ممکن ہے کہ طلح منضود کو ایک قبیلہ طلع منضود کہے یا قاف کو خا یا کاف کہے جیسا کہ حیدر آباد یا پنجاب والے ادا کرتے ہیں مگر اس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ لاکھ قاف لکھیں ایک پنجابی یا ترک کاف کہے گا۔ ایک مصری جیم کو گاف اور ایک ایرانی قاف کو غین بولے گا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اسی قرأت لفظی میں صحابہ کرامؓ کے پاس بالکلیہ محفوظ تھا جن میں رسول اللہؐ نے وحی الٰہی کے بعد تلاوت کیا تھا۔ آپؐ افصح العرب تھے اور یہ ناممکن تھا کہ قریش ان الفاظ کو بدل دیتے یا سات طرح سے تلفظ کرتے۔ اور کتابت میں تو یہ قطعی ناممکن تھا کہ رسول اللہؐ کے تلفظ کو کسی طرح بدلا جا سکتا۔

اصل میں اختلاف قرأت اس میں تھا کہ کوئی کسی سورہ کو پہلے پڑھتا تھا کوئی کسی کو۔ ہر صحابی اپنی پسند اور ضرورت کے اعتبار سے سورتوں کے مجموعے بنائے ہوئے تھا۔ پورا قرآن کسی ایک ترتیب سے کسی کے پاس نہ تھا۔ البتہ مختلف لوگوں کو پورا یاد تھا۔ اسی کو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کرا کے تلفظ قریش نہیں بلکہ تلفظ رسولؐ کے مطابق رکھ لیا تھا جو مروان بن الحکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے لے کر ضائع کر دیا۔

کلامِ رحمان اور القائے شیطان

ما محمد الا رسول، قد خلت من قبله الرسل ٥ ھذا نذیر من النذر الاولیٰ ٥ (النجم) ما کنت بدعاً من الرسل ٥	محمدؐ رسولوں میں سے ایک ویسے ہی رسول ہیں جیسے پہلے گزرے ہیں۔ محمدؐ ویسے ہی نذیر ہیں جیسے پہلے گزرے۔ محمدؐ کوئی انوکھے رسول نہیں ہیں۔

وہ کلام جس میں رحمت و ہدایت ہو رحمانی و ربانی ہے۔ بخلاف اس کے جس کلام میں ظلمت و ضلال کی تعلیم ہو وہ شیطانی ہے۔

نوعیت وحی والہام: سورۃ العلق ہی سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خدا انسان کو قلم کے ذریعے سے علم دیتا ہے یعنی وہ اپنے حواس سے جن باتوں کا ادراک کرتا ہے اور ان کو قلم کے ذریعے سے لکھ کر سائنٹفک یا منطقی بنا لیتا ہے اور سحر و کہانت کی طرح راز میں نہیں رکھتا، وہ وحی یا الہام ہے۔ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم یا نیکی کے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ "وسواس الخناس" جو پروہتوں اور ساحروں کی آمدنی کا ذریعہ بن کر لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور جن کو ساحر وغیرہ راز میں رکھ کر تنقید و نظر سے دور رکھتے ہیں، وہ سب الہامات شیطان ہیں۔ اسی کی تفصیل ن والقلم وما یسطرون سے آگے کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نوحؑ کے زمانے سے یہی طریقہ وحی رہا ہے کہ سچا علم خدا دیتا ہے۔ (انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوح والنبیین بعدہ) ظاہر ہے کہ قلم کا استعمال حضرت نوحؑ کے وقت میں نہیں تھا۔ قلم سے مراد یہی ہے کہ وہ علم جو نقد و نظر کی کسوٹی پر پورا

اُترے اور آشکارا ہو۔ راز میں نہ رکھا جائے۔ ورنہ وہ سحر ہے۔ اسی لئے کفار قریش جو وحی الٰہی کو نہیں مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ قرآن سحر ہے، اور کلام بشر ہے (ان ھذا الا سحرٌ یوثر۔ ان ھذا الا قول البشر) وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جس طرح ہمارے ساحروں اور کاہنوں کو شیاطین وجنات کلام سکھاتے ہیں اسی طرح کا کلام قرآن بھی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی۔ یہ کلام شیاطین نہیں بلکہ کلام روح الامین ہے، جو خدا بھیجتا ہے۔ اور اس قلبی وحی کو رسول اللہؐ صاف اور سلیس زبان (عربی مبین) میں لوگوں کو سناتے ہیں: وانہ لتنزیل رب العالمین۔ نزل بہ الروح الامین، علےٰ قلبک لتکون من المنذرین، بلسان عربی مبین ۰ (الشعراء ۱۹۲ - ۱۹۵) پھر اس کے بعد ہی وحی بالفظ کی تردید کردی اور یہ بتایا کہ یہ ویسا ہی بالمعنی کلام ہے جیسا کہ گزشتہ کتابوں میں آچکا ہے، حالانکہ اُن معانی کے الفاظ راویوں نے بتائے ہیں فرمایا کہ "وانہ لفی زبر الاولین" (۱۹۶) اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ کلام ربانی ہے کلام شیطانی نہیں ہے ما تنزلت بہ الشیاطین (۲۱۰) وہ تو اس کلام کو سن ہی نہیں سکتے۔ انھم عن السمع لمعزولون (الشعراء ۲۱۲)

تنزیل ربانی اور خطوات الشیطان: غیب یعنی چھپی ہوئی حقیقتوں سے جو خیالات وتصورات پیدا ہوتے ہیں یا جو احساسات جاگ اٹھتے ہیں انھیں عربی زبان میں وحی والہام کہتے ہیں۔ ان عواطف و امیال کو انسان و حیوان دونوں کسی نہ کسی طرح ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ عموماً انسان کا ذریعۂ اظہار نطق ہوا کرتا ہے۔ لیکن اب تک کوئی زبان ایسی نہیں بنی جو انسان کے محسوسات کی صحیح اور پوری ترجمانی کر سکے۔ اس لئے اپنے محسوسات و عواطف کے اظہار اور شعر وادب کے نقص کو پورا کرنے کے لئے انسان نے

نطق وگویائی کے دوسرے ذریعے بھی ایجاد کیئے ہیں، جنھیں فنون لطیفہ کہتے ہیں۔ یعنی جو کام شاعر و ادیب اپنی زبان سے لینا چاہتا ہے اُسی کو مصور و نقاش خطوط و الوان سے معمار و سنگتراش سنگ و خشت سے اور مغنی و موسیقار اپنی آواز سے لینے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنی تخلیق میں خواہ وہ شعر ہو یا تصویر عمارت ہو یا نغمہ اپنے قلب کی ان الہامی کیفیتوں کو بھرنا چاہتا ہے جنھیں وہ محسوس کرتا ہے، اور پھر یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس تخلیق کے دیکھنے یا سننے والوں پر بھی وہی وجدانی کیفیت طاری ہو جائے جو خود اُس پر ہوئی ہے۔

رسول عربیؐ نے قرآن کے ذریعے بتایا کہ وحی و الہام کی کیفیتیں رحمانی بھی ہوتی ہیں اور شیطانی بھی۔ رحمانی وحی تاریکی سے روشنی کی طرف، ضلال سے ہدایت کی طرف اور خوف سے امن و اطمینان کی طرف لے جاتی ہے۔

خطوات شیطان یا شیطانی القا اس کی ضد ہوتا ہے۔ چونکہ عربوں کے شاعر، ساحر، کاہن اور نجومی یہ دعوے کیا کرتے تھے کہ ان کو بھی غیب کا شعور و علم ہوتا ہے اور یہ علم شیاطین و اجنّہ یعنی وسواس الخناس یا رئی یا تابع من الجن کے ذریعے سے ہوتا ہے، اس لئے قرآن نے ان کے سحر و شعر و کہانت کو شیطانی کہا۔ اور بتایا کہ سچے اور حقیقی علم کا سرچشمہ اللہ ہے وہی انسان کو سچّا علم دیتا ہے۔ علم الانسان مالم یعلم ہ الرحمان علم القرآن ؀ اور علم الانسان بالقلم پر غور کیجئے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ "وحی" یا اشارہ خفی جو خدا کی طرف سے (من عند اللہ) ہوتا ہے، وہ بے لفظ و صوت ہوتا ہے، اور انسان کے دل میں ایک کھٹک محسوس ہوتی ہے، جسے وہ اپنے الفاظ میں یا فنون لطیفہ کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ

اللہ کسی بشر سے کلام نہیں کرتا، البتہ وہ وحی (یا اشارۂ خفی) یا پردے کے

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطَ اللّٰهِ ۔

پیچھے سے کلام (دل میں کھٹک) پیدا کرتا ہے، یا وہ کوئی ایلچی (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اُس کی مرضی وحی کرتا ہے، وہ اللہ برتر و حکیم ہے (حکمت وحی وہی جانتا ہے) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تجھ پر روح (وحی یا فرشتہ) بھیجی، حالانکہ تو نہ الکتاب (علم و قانون) کو جانتا تھا اور نہ الایمان (باللہ و بعث بعد الموت) کو۔ دلیکن ہم نے اس وحی کو نور بنا دیا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں جن کی ہدایت چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اور یقیناً تو بھی صراط مستقیم کو اس کے ذریعے سے بتاتا ہے۔ وہ صراط مستقیم اللہ کی شاہراہ ہے۔ (آخر سورۂ شوریٰ)

اسی طرح قرآن نے بتایا کہ ہر قوم خدائی پیغام یعنی خدا پرستی کا پیغام لانے والے یہی کہتے رہے ہیں (ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ سورۃ النحل) پھر فرمایا:-

وانہ لتنزیل رب العالمین ○ نزل بہ روح الامین علی قلبک ○ (الشعراء)

یہ تنزیل قوموں کے آقا کی طرف سے ہے۔ جو روح الامین کے ذریعہ قلب رسول پر نازل ہوتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وحی من جانب اللہ ہوتی ہے۔ اللہ براہ راست نبیوں سے کلام نہیں کرتا۔ بلکہ بذریعہ تنزیل کرتا ہے یعنی دل میں ایک بات پیدا کر دیتا ہے، انشراح صدر ہو جاتا ہے، دل میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور پھر اس پیغام کو اپنے الفاظ میں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ نزول کے معنی بھی پیدا کرنے کے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ باس شدید...... (سورۃ الحدید رکوع ۳)

ہم نے اپنے ایلچی نشانیاں دے کر بھیجے اور پیدا کیا (انزلنا) ان کے ساتھ قانون (کتاب) اور عدل (میزان) تاکہ لوگ انصاف پہ سیدھے رہیں۔ اور ہم نے لوہا پیدا کیا (انزلنا) جس میں سختی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جو وحی رسول اللہؐ کے قلب پر نازل ہوتی تھی، وہ اللہ کے پاس سے (من عند اللہ) ہوتی تھی اور خدا اور اس کے فرشتے (رسل اولی الاجنحہ) شاہد ہیں کہ یہ وحی خدا کے پاس سے لاکر قلب رسولؐ تک پہنچاتے ہیں (لٰکِنِ اللّٰہُ یشھد بما انزل الیک انزلہٗ بعلمہٖ ج والملائکۃُ یشھدون ط وَ کَفٰی باللّٰہِ شَہِیْداً۔ النساء ۱۶۶)

قرآنی وحی ویسی ہی وحی من جانب اللہ ہے جیسی کہ نوحؑ اور دوسرے نبیوں پر وحی ہوا کرتی تھی۔ کسی کو خواب دکھائی دیتا تھا، کسی کے دل میں ہدایت راہ پاتی تھی وغیرہ۔ (انّا اوحینا الیک کما اوحینا الٰی نوح والنبیین من بعدہٖ)

اس کلام من عند اللہ کو کلام اللہ اور قول اللہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے معنی امر اللہ کے بھی ہیں۔ جیسا کہ زمین و آسمان کو حکم بذریعہ وحی دیا گیا، (وقیل یا ارضُ ابلعی ماءَکِ، ویا سماءُ اقلعی۔ سورۂ ہود ۴۴)

غرضکہ ان تفصیلات سے جو قرآن میں پائی جاتی ہیں ربانی وحی کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک صاحب اختیار اور ذی شعور مخلوق (جن و انس) کے لئے ہے۔ اور دوسری جمادات و نباتات و حیوانات کے لئے ہے۔ مثلاً اَوْحَیْنَا اِلَی النَّحل، اور ارض و سما، وحش و طیور کے متعلق کہا گیا کہ (مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِہٖ) وہ امر الٰہی یعنی وحی و حکم الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتے "طوعاً و کرھاً" "سجدہ" یعنی طاعت پر مجبور ہیں۔

ذی شعور انسانوں اور جنوں پر اُن ہی کی قوم کے لوگوں اور ان کی زبانوں کے ذریعے خدائی پیغامات پہنچائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں اختیار دیا گیا ہے، اور اختیار کے ساتھ ساتھ اخلاقی ذمہ داری اور جزا و سزا کی خبر بھی دی گئی ہے، اس لئے ثقلین (جن و انس) وحی الہٰی پر چلنے کے لئے غیر ذی شعور مخلوق کی طرح مکلف نہیں ہیں۔ انھیں اختیار ہے کہ وہ "طاغوت" سے "اجتناب" نہ کریں۔

عرب کے شاعر، ساحر اور کاہن قرآن کو بھی اُسی طرح "قول شیطان رجیم" کہتے تھے جیساکہ خود ان کے ساحروں یا شاعروں اور کاہنوں کا کلام ہوتا تھا۔ وہ اللہ اور شیطان میں رشتہ جوڑ چکے تھے اور اپنی دیویوں کو بنات اللہ اور جنّیہ کے بطن سے تولّد ہونا قرار دیتے تھے۔ یعنی اللہ اور شیطان دونوں کو شریک کر کے دونوں کی پرستش میں اپنا فائدہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے اس شرک کو بھی ختم کیا اور بتایا کہ ذریعۂ علم شیاطین و جن نہیں ہیں، نہ لات منات، عزّیٰ وغیرہ ہیں بلکہ علم کا سرچشمہ اللہ ہے اور وہ مشخص خدا یا دیوتا نہیں کہ براہ راست کسی انسان سے کلام کرے۔ اس کا کلام خفی دل میں خیالات موجزن کرتا ہے، جنھیں رسول یا نبی اس قوم کی زبان میں مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن کے مخاطب کا ذہنی پس منظر اور اُس کی زبان کا وہ مفہوم جو مخاطب کے ذہن میں ہوتا ہے، ہر مفسر کے لئے جاننا ضروری ہے۔

قرآنی الفاظ رسولؐ کے ہیں: امام ولی اللہؒ محدّث دہلوی نے اس خیال کو کہ معنی اللہ کی طرف سے رسولؐ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور الفاظ خود رسولؐ کے ہوتے ہیں، اس طرح بیان کیا ہے:۔

"فمن ذلک (ای من الالٰہیات) القرآن العظیم وذالک ان الفاظ	قرآن عظیم خدا کی نزدیکی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے الفاظ عربی

القرآن انما هی من لغة العربیه
اللتی یعرفها محمد صلعم ویتخیلها
والمعانی فائضة من الغیب
تعلیماً له صلعم تدلیاً الی الخلق
فهو صار کلاماً الهیا۔ انما صار
لانّ ارادة الخیر بالناس
امتدت فی خیاله علیه السلام
فهی اللتی جمعت الالفاظ
ونظمها ثم امدّ فی هذا
النظم فالبس لباساً محاکیاً
للجبروت فصار بذالک تدلیاً
الهیا۔ وسمّی کلام اللہ"
(التفہیمات الالھیہ ص ۵۸۱)

لغت کے ہیں، جنھیں محمد صلعم جانتے تھے اور اسی زبان میں سوچتے تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے غیب سے معانی (ان کے قلب میں) پیدا ہوتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے ذریعے سے وہ لوگوں کی ہدایت کر سکیں اس طرح یہ (یعنی رسولؐ کے الفاظ اور وحی کردہ معانی) مل کر کلام الٰہی بن گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہؐ انسانوں کی بھلائی کا ارادہ کرتے تھے۔ یہ خواہش تھی جو لفظوں کو جمع کر کے ایک نظم و ترتیب دیتی۔ پھر وہ اسے موجودہ نظم قرآنی کے ساتھ منظم کرتے اور خدائی جبروت کے مطابق اسے تشکیل دیتے۔ اسی لئے یہ خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا اور کلام اللہ کہلایا۔ (التفہیمات الالہیہ ص ۵۸۱)

باوجود ان تصریحات قرآنی کے کفار مصر تھے کہ قول اللہ کو ہم نہیں جانتے۔ یہ قرآن یا تو قول شیطان ہے، یا خود رسول اللہؐ نے بغیر خدا کی مدد کے انسانوں کی مدد سے تیار کر لیا ہے اور پرانے قصے کہانیاں بیان کر دئے ہیں۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے: یقولون انه لمجنون ۵ ما انت بنعمة ربك بمجنون ۵ (ن والقلم) فذکّر فما انت بنعمة ربك بکاهن ولا مجنون ۲۹ ام یقولون شاعر؟ نتربص به ریب المنون ۳۰ (الطور) ان هذا الا اساطیر الاولین ۵ قرآن بار بار بتاتا ہے کہ یہ قول فصل ہے، اور تمہارے اقوال کی طرح ہزل نہیں ہے۔ یہ نور وہدایت ہے اور پرانے نبیوں کا مصدق ہے۔

نزول قرآن علی لسان عمرؓ: قرآن میں کئی آیتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے حضرت عمرؓ کی زبان سے رسول اللہؐ نے سنیں اور انھیں قرآن میں یہ کہہ کر شامل کر لیا کہ حق بات لسان عمرؓ پر جاری ہو گئی۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جو خدائی باتیں توراۃ و انجیل اور دوسری خدائی تعلیمات میں ہیں اور جو حق باتیں دوسرے انسانوں کی زبانوں پر جاری ہوئی ہیں، خواہ وہ کسی زبان میں اور کسی نظم و ترتیب سے ہوں، معناً خدا کی طرف سے ہیں۔ لفظاً وہ عربی یا عجمی کسی زبان میں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کلام من عند اللہ کو لفظاً خدا کا کلام سمجھنا، ایک قدیم صفت الٰہیہ کو حادث قرار دینا ہے۔ خود امام بخاری کا یہی مسلک تھا کہ الفاظ قرآن حادث ہیں۔ اور شاہ صاحب نے تو صاف صاف بتا دیا کہ معنی کا القا بذریعہ فرشتۂ وحی (رسول کریم) قلب رسولؐ پر ہوتا تھا اسی لئے آپ کو حکم تھا کہ وحی نازل ہوتے ہی زبان کو حرکت نہ دیا کریں، بلکہ جب اس کے معنی قلب میں جمع ہو جائیں تو اپنے الفاظ میں اس کی قرأت کریں (لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ط ان علینا جمعہ، وقرانہ ج فاذا قرانٰہ فاتبع قرانہ؛ اس کے بعد ضرورت ہوگی تو ہم اس کی تفصیل بھی بیان کریں گے (ثم ان علینا بیانہ) (سورۃ القیامہ)

اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ: رسول عربیؐ کی کیفیت وحی خود قرآن میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ فوراً اس کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپؐ اپنے دل میں جلدی کی وجہ سے اُن معنوں کو الفاظ کا بہترین جامہ نہ پہنا سکتے تھے۔ اس پہ خدا نے ہدایت فرمائی کہ زبان سے وحی کو بولنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ ہم ان معنوں کو تمہارے قلب میں جمع بھی کر دیں گے اور بلوا بھی دیں گے۔ اس کے بعد تم اس نظم و

ترتیب کے مطابق جو بذریعہ وحی بتائی جائے اُس کو بولو۔ اس کے بعد بھی جو تفصیلات بیان رہ جائیں گی انھیں کھول کر بتانا (بیان کرنا) ہمارے ذمہ ہے۔ (فاتبع قراٰنہ۔ ثم ان علینا بیانہ) کے معنی صاف ہیں کہ جو وحی قلب رسول میں خدا "جمع" کرے گا، اس کے الفاظ رسول اللہ صلعم فرشتہ وحی کے ذریعے سے بنائیں گے، اور جب وہ خداوندی معنی الفاظ کے جامہ میں نہ سمائیں گے تو پھر خدا انھیں دوسرے طریقے سے معناً "بیان" کرے گا۔ ؎

بسکہ حیرانم درون سینہ چوں جا کردۂ ÷ ہر تو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں

وجدان والہام و قلب: نفسیات واخلاقیات کی زبان میں وہ استعداد جس کے ذریعے سے ہم اپنے اعمال واحساسات کے متعلق یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ حق ہیں یا باطل، وجدان یا ضمیر کہلاتی ہے۔ عام بول چال میں اسے دل یا قلب کہتے ہیں۔ انگریزی میں کانشنس کا لفظ بولا جاتا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں "قلب" سے یہی قلبی استعداد مراد لی جاتی تھی "نزول وحی علیٰ قلب رسول" کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ "وحیٔ رسول کے وجدان کی آواز ہوتی ہے" تو عام انسان اسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ "رسولی ضمیر" کی آواز میں عام انسانیت کی سعادت و فلاح مضمر ہوتی ہے، رسول کا وجدان، وجدان سلیم و صحیح ہوتا ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اس میں رسول کی خود غرضی کو دخل نہیں ہوتا۔ اُس کی دعوت معروف اور حق کی طرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جس کا قلب یا ضمیر خود غرضی حسد اور جاہ و مال طلبی کے وسوسوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ مُنکر اور باطل یعنی گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی اصول پر بعض صحابہؓ کے ضمیر کی پکار کو آنحضرتؐ نے قرآن میں جگہ دے دی۔ اسی لئے ہم تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کا کوئی حکم منسوخ ہے۔ البتہ ہم یہ مانتے ہیں کہ حالات کے اعتبار سے بعض ذرائع حصول مقصد مؤخر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نسخ نہیں تاخیر ہے۔

حروف مقطعات مبہم نہیں ہیں

حروف مقطعات: یعنی حروف ابجد کے متعلق بھی مفسرین بالرائے کہتے ہیں کہ ان کا مطلب ہم نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ ان کو ایک آیت سمجھتے ہیں یعنی یہ بھی ان احکام الٰہیہ میں سے ہیں جن پہ سمجھ لینے کے بعد عمل ضروری ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے پڑھیے تو سورۃ العلق ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حروف مقطعات (ابجد) جن سے کلام بنتا ہے قلم کے ذریعے سے اللہ دیتا ہے۔ یعنی یہی حروف وکلمات (نہ کہ سحر و کہانت) ایسے ہیں جو ذریعۂ علم الٰہی ہیں۔ مثلاً ن والقلم، وما یسطرون، کی خدا نے شہادت دی ہے۔ کہ کتاب مبین یا علم مبین کا لانے والا بنعمۃ ربک "مجنون" نہیں ہے کہ جنوں کے ذریعے سے سحر و کہانت حاصل کرے۔ اسی طرح (الم: ذلک الکتاب، ال مر، تلک آیات) میں "ذلک" اور "تلک" کے اشارے ان ہی حروف مقطعات کی طرف ہیں کہ یہی (ھدی للمتقین) ہیں، اور یہی (آیات کتاب مبین) ہیں۔ اور جو لوگ اشتقاق کبیر سے واقف ہیں ان پہ عیاں ہے کہ عبرانی، سریانی اور عربی میں مختلف حروف ابجد کے بھی معنی ہیں۔ مثلاً یاسین اور حامیم کے معنی ہیں اے انسان۔ باؔ کے معنی ہیں بیت یا گھر۔ جیم کے معنی ہیں جمل یا اونٹ وغیرہ۔ بہر حال حروف مقطعات مبہم المعنی نہیں ہیں جیسا کہ ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت کی ہے کہ (قال المتشابہات، فیما بلغنا، الم، المص والمر دالر: اتقان سیوطی: نوع محکمات و متشابہات)

قرآن کی کوئی آیت مشتبہ المراد نہیں

آیات محکمات و آیات متشابہات:

باوجودیکہ ایک معمولی صرفی بھی جانتا ہے کہ شبہ کو تفاعُل، افتعال اور تفعیل کے ابواب میں منتقل کر کے قرآن نے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں شبہ کے معنی بدلے ہوئے ہیں لیکن تفسیر بالرائے کرنے والے تشابہ، اشتباہ، اور تشبیہ تینوں کے معنی باب افتعال سے "مشتبہ المراد" بتاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ وہ نہیں جانتے ایک باب تفاعل اور دوسرا تفعّل (تشابہ و تشبہ) بھی ہے۔

قرآن میں کوئی آیت مشتبہ المراد یا غیر واضح نہیں ہے (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا)۔ خود قرآن کہتا ہے (کتاب احکمت اٰیاتہ) یعنی یہ ایسا قانون ہے جس کی مختلف دفعات محکم و مضبوط ہیں۔ پورے قرآن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی آیت کے بعد فرمایا کہ ثم فصّلت من لدن حکیم خبیر (11/1) یعنی ان ہی محکم آیتوں کی پھر تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تعلیم نور ہو (جعلناہ نورا نھدی بہ من نشاء) اس میں شک شبہ یا ظلمت کہاں داخل ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترتیب نزول سے قرآن نہ پڑھنے کی وجہ سے یہ اندھیر ہوا کہ قرآن کی آیتوں کو مشتبہ المراد سمجھ لیا گیا۔ پہلے سورۃ النساء پڑھ لی جاتی تو آل عمران کی آیت ۳ (ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ اٰیاتٌ محکماتٌ ھن ام الکتاب) واُخر متشابہات) میں نہ تو متشابہ کو محکم کا ضد سمجھا جاتا اور نہ (فی قلوبھم زیغٌ) کے متعلق یہ شبہ ہوتا کہ یہ منافق مسلمان ہیں۔

ہر قرآن کا پڑھنے والا جانتا ہے کہ کل قرآن اور اس کی آیات متشابہ ہیں یعنی شبہ میں ڈالنے والی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ (اَللّٰہُ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابھاً مثانی ۔الزمر $\frac{39}{23}$) اور مثانی ہیں یعنی بار بار دہرائی گئی ہیں۔ یعنی قرآنی تعلیمات کی آیات نہ صرف قرآن کی ایک دوسری آیتوں سے ملتی جلتی ہیں بلکہ توراۃ و انجیل وغیرہ سے بھی مشابہ ہیں اور ان کتابوں میں بھی بار بار دُہرائی جاچکی ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نصرانیوں کے دلوں میں" زیغ" ہے، وہ اُن آیتوں کے پیچھے تو دوڑتے ہیں جو اُن کی کتابوں (توراۃ وغیرہ) میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن کی محکم (فیصلہ کن اور بنیادی) تعلیمات کو بھول جاتے ہیں: مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت عیسٰےؑ کلمۃ اللہ تھے (القاھا الیٰ مریم) یہ انجیل میں بھی ہے۔ نصاریٰ اس کو تو مان لیتے ہیں اس لئے کہ یہ متشابہ آیت ہے۔ مگر قرآن جو سورۂ آل عمران کے شروع ہی میں کہتا ہے کہ اللہ حی و قیوم ہے۔ مسیح کو اللہ نہ مانو۔ اس لئے کہ اللہ کو موت نہیں آسکتی۔ وہ احد و صمد ہے حی لایموت ہے تو اس محکم آیت کو یہ نصاریٰ نہیں مانتے۔ یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ سورۂ آل عمران کا روئے سخن نصارائے نجران کی طرف ہے۔ اور اُن ہی نصرانیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم میں" الراسخون فی العلم" بھی ہیں جو متشابہ آیات قرآن و انجیل کی تاویل جانتے ہیں۔

بہرحال اگر آل عمران سے پہلے سورہ لنساء پڑھ لی جاتی تو واضح ہو جاتا کہ الراسخون فی العلم کے بعد وقف کی بحث غیر ضروری ہے۔ اس سورہ میں صاف صاف (الراسخون فی العلم) سے (منھم) یعنی اہل کتاب مراد ہیں۔ اس لئے کہ اس جملہ کے ساتھ ساتھ (مومنون) کا لفظ مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور سورۂ آل عمران کی طرح اس کا روئے سخن بھی اہل کتاب کی طرف ہے۔ آیات یہ ہیں: وقولھم انا قتلنا مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ ج وما قتلوہ وما صلبوہ لاکن شبہ لھم، وَاِنّ

الذین اختلفو فیہ لفی شک منہ ط ما لہم بہ من علم الا اتباع الظن ۚ وما قتلوہ یقیناً .... اسی سلسلے میں یہود سے قرآن نے کہا تم میں جو راسخون فی العلم ہیں (اور مسلمان) وہ قرآن کو مانتے ہیں اور اُن متشابہ آیتوں کو بھی مانتے ہیں جو توراۃ میں ہیں (لکن الراسخون فی العلم منہم والمؤمنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک ..... النساء ۱۶۲) یعنی اہل کتاب کے راسخون فی العلم اور ہم مومنوں کو توراۃ اور قرآن پر کوئی شبہ نہیں ہے غرضکہ متشابہات کے معنی ہیں وہ مفصل آیتیں جو محکمات کی تشریح کے طور پر قرآن میں تو ہیں ہی، وہ کتب اولین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں شبہ کی گنجائش نہیں، اسی کے آگے یہ بتایا گیا ہے کہ (انما المسیح بن مریم رسول اللہ وکلمۃ القاھا الی مریم وروح منہ فآمنوا باللہ ورسلہ (صیغہ جمع) ولا تقولوا ثلاثۃ)۔ یہی بات سات آٹھ سال پہلے ہجرت حبشہ کے وقت سورۂ مریم میں بھی کہی جا چکی ہے۔

اہل کتاب کی بُرائی اور تعریف:

سورۃ النساء کے بعد سورۃ آل عمران نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں یہود کی تعریف اور بُرائی دونوں کی گئی ہے۔ مثلاً پہلے فرمایا کہ ان کا ایک گروہ قرآن کو حق جانتے ہوئے بھی نہیں مانتا (یا اھل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل) اور مومنوں پر جو قرآن نازل ہوا ہے اس کے متعلق وہ گروہ کہتا ہے کہ صبح کو مانو اور شام تک انکار کر دو (آمنوا وجہ النہار واکفروا آخرہ) پھر اُن کی تعریف میں فرمایا کہ اہل کتاب کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو امانتدار ہے (ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک) اس کے علاوہ فرمایا کہ یہود میں بھی چند مومن ہیں۔ لیکن اگر سب مومن ہو جاتے تو ان کے لئے اچھا تھا:- (ولو آمن اھل الکتاب لکان خیراً لھم منہم المؤمنون واکثرھم الفاسقون ہ آل عمران رکوع ۱۲) اور فرمایا

لیسوا سواءً من اہل الکتاب امۃٌ قائمۃٌ یتلون آیات اللہ
اناء اللیل وھم یسجدون .... اولئک من الصالحین ٥ (آل عمران ۱۲ع)

(نوٹ) محکمات ومتشابہات کے سلسلے میں ایک اسکول امام نووی شارح صحیح مسلم کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ امر خدا سے بہت بعید ہے، کہ وہ اپنی مخلوقات سے ایسے الفاظ میں کلام کرے کہ وہ اسے کسی طرح نہ سمجھ سکیں"۔

لیکن انھوں نے بھی یہ دھوکا کھایا ہے کہ "متشابہ (بقول قتادہ وعکرمہ) ضد یا نقیض ہے محکم کی"۔ اگر ترتیب نزول سے پڑھتے تو معلوم ہو جاتا کہ متشابہ کا تعلق اہل کتاب کی کتابوں سے ہے اور ان ہی کے "راسخون فی العلم" سے ہے۔ مومن کے لیے کسی آیت کے معنی مبہم نہیں۔ حتی کہ اہل کتاب کے راسخون فی العلم بھی انھیں اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور انھیں سمجھتے ہیں۔

اہل کتاب، اہل ذکر اور اہل عقل: اسلام یعنی خدا پرستی دین فطرت ہے (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا) اور حضرت آدمؑ یعنی نوع انسانی کی ابتدا سے، ہر قوم میں فطری طور پر خدا کی طرف سے یہ دین جاری ہے۔ شیطان اس دین سے منحرف کرتا رہتا ہے، حتی کہ بچوں کے والدین ہی شیطانی گرگے بن کر انھیں فطری دین سے ہٹا کر یہودیت ونصرانیت کی فرقہ بندیوں میں پھنسانے لگتے ہیں (یہودانہٖ وینصرانہٖ) لیکن اسلام کل دنیا کے اہل کتاب، اہل ذکر اور اہل عقل کو برابر کا درجہ دیتا ہے اور عقل ودانش کو مومن کی گمشدہ چیز بتاتا ہے کہ اُسے جہاں ملے وہ اپنی سمجھ کر اس پر قبضہ کرلے (الحکمۃ ضالۃ المؤمن) اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ترقی کے دور میں (باوجود بنو امیہ کی عربیت کے) مسلمانوں نے دین فطرت پر نظر رکھی، اور ہر قوم وملک کے اولوالالباب اور اہل ذکر سے روحانی اور مادی علوم سیکھے اور سکھائے۔ البتہ دور انحطاط کی تنگ نظری نے اُنھیں کوتہ اندیش وخود پرست بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جملہ اہل کتاب سے نفرت کرنے لگے اور بھول گئے کہ قرآن بار بار کہہ چکا ہے کہ دنیا کے ہر اہل ذکر اور اہل عقل سے دوستانہ بڑھاؤ:۔

۱۔ فاسألوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ٥ (النحل ۴۳)

قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں

ناسخ منسوخ: اسی طرح قرآن میں نسخ وتبدیل آیات کا جو ذکر ہے وہ قرآنی آیات کا نسخ نہیں، بلکہ یہود کی ان خود ساختہ آیتوں (احکام) کی تبدیلی کا ہے جو یا تو حماقت سے یہود وغیرہ نے اپنے لئے اصر و اغلال بنا لئے تھے جیسے کہ اونٹ کا گوشت نہ کھانا یا سبت کے دن شکار نہ کرنا۔ یا تالمود (نہ کہ توراۃ) کی شہادت دیتے تھے کہ سود لینا جائز ہے۔ حالانکہ سود سے بدتر غلامی کوئی نہیں۔ (کل الطعام کان حِلاً لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علیٰ نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ)۔ اسی لئے قرآن نے کہا کہ یہ باتیں خود ساختہ ہیں توراۃ میں نہیں ہیں (قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین۔ آل عمران۔ رکوع ۱۰) خدا نے سود حرام کیا تھا لیکن یہودی لیتے تھے اسی وجہ سے ان پر طیبات حرام کردی گئی تھیں (فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیباتٍ اُحلت لھم وبصدھم عن سبیل اللّٰہ کثیراً وّ اخذھم الربوا وقد نھوا عنہ) واکلھم اموال الناس بالباطل .... النساء رکوع ۲۲) ان آیات کے پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل آیات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی :۔

(۱) یمحوا اللّٰہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب (الرعد ۳۹)
(۲) واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ .... (النحل ۱۰۳)
(۳) ما ننسخ من اٰیۃٍ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (البقرہ ۹۹)

رسول عربی کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا

در دل ہر امتی کز حق مزہ ست — روئے و آواز پیمبر معجزہ ست (رومی)

آیات اللہ (معجزات): آیت کے معنی ہیں نشان، دلیل اور دفعات علم و قانون۔ قرآن کا ہر فقرہ بھی ان ہی معنوں میں آیت کہا جاتا ہے کہ یا تو وہ خدا کے موجود ہونے کی دلیلیں اور نشانات ہیں، یا اس کے احکام کی قانونی دفعات ہیں، یا اس کے بتائے ہوئے علم کے جملے ہیں۔

آیات بینات ان روشن دلیلوں یا نشانوں کو کہتے ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ باتیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ سورۃ العلق میں اسی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے وجود کی سب سے بڑی بیّن اور روشن دلیل (آیت) یہ ہے کہ وہ خالق ہے۔ بالفاظ دیگر غیر اللہ میں یہ قدرت نہیں کہ وہ ایک ذرّہ بھی خلق کر سکے یعنی اللہ کے سوا سب خلق کرنے سے عاجز ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے مجازی معنی "معجزہ" یعنی عاجز کرنے والی چیز کے ہو گئے۔

وفی الارض آیات للموقنین ط
وفی انفسکم افلا تبصرون ہ
وفی السماء رزقکم وما توعدون ہ
فورب السماوات والارض انہ
لحق مثل ما انکم تنطقون ہ (الذاریات ۲۰ تا ۲۳)

آنکھ والوں کے لئے کل دنیا آیات (معجزاتِ الٰہیہ) سے بھری پڑی ہے، اور اگر تمہارے پاس آنکھیں ہیں تو خود تمہارے اندر آیات (اللہ کے موجود ہونے کے نشان) موجود ہیں۔ اور کیا یہ آیت (محیر العقول نشان) نہیں کہ آسمان سے تمہیں رزق (بذریعہ بارش) ملتا ہے اور دوسری چیزیں بھی ملتی ہیں۔ ان ہی آسمانوں اور زمینوں کے مالک کی قسم یہ قرآن بالکل حق کہتا ہے اور تمہاری زبان میں کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔

مُعجزاتِ رسولِ عربی: عام طور پر دنیا میں یہ قاعدہ تھا اور اب بھی ہے کہ جب کوئی ایلچی (رسول) کسی کے پاس جاتا ہے تو اس کو وہ نشان (یا آیت) دکھاتا ہے جو بھیجنے والے نے دیا ہو۔ اُسے دیکھ کر رسول یا ایلچی کے متعلق یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ جو پیغام وہ لایا ہے وہ سچا ہے۔

کفارِ قریش نے رسول اللہ ؐ سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر خدا نے آپ کو ایلچی بنا کر بھیجا ہے تو پہلے تو یہ ثابت کیجئے کہ خدا ہے۔ اس کے بعد بھیجنے والے کا کوئی نشان (آیت) دکھائیے کہ واقعی آپ کو اس نے بھیجا ہے۔

مسئلہ وجودِ باری کے جواب میں آنحضرت ؐ نے سیکڑوں ثبوت (آیات) دئے، جو مکی قرآن کی اکثر سورتوں میں تفصیل سے درج ہیں۔ سورۂ بقرہ میں بھی آیات کا ذکر ہے مگر وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے اور مکہ ہی میں ذکر ہوا۔ لیکن کفار نے انہیں نہ مانا۔

جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق تھا۔ جس میں آنحضرت ؐ سے نشان (CREDENTIALS) مانگا گیا تھا، آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ ایسے نشانات دیکھ لینے کے بعد بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم مان لوگے کہ خدا ہے، اور وہ اپنے رسول بھیجا کرتا ہے۔ تم تو خدا کے وجود کا نشان ہی مانگتے ہو۔ بنواسرائیل نے تو یہ کہا تھا کہ خدا ہی کو دکھلا دو (نری اللہ جہرۃً)

بہر حال جب تم باوجود خدا کی نشانیوں کی کثرت کے اُس کو ماننے سے انکار کرتے ہو، تو یہ ثابت کرنا بھی غیر ضروری ہے کہ میں اس کا رسول ہوں۔ اگر تمھیں اس بات میں شبہ ہے کہ خدا اپنے رسول بھیجا کرتا ہے تو جن قوموں میں رسول آ چکے ہیں اُن سے پوچھ لو (فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (الانبیاء)) میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں (ما انا بدع من الرسل ہ قد خلت من قبلہ الرسل)۔ مگر کفار یہی کہتے رہے کہ جیسے معجزے اگلوں کو دئے گئے تھے ویسے دکھاؤ۔ فلیاتنا بایۃ کما ارسل الاولون (الانبیاء)

پھر کفارِ مکہ نے کہا کہ آپ ؐ بار بار یہ کہتے ہیں کہ جو قوم رسولوں کی ہدایت

کو نہیں مانتی اُس پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ آپ عاد، ثمود، قوم لوط و قوم فرعون کے قصے سُناتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ سچ ہے کہ آپ اللہ کے ایلچی ہیں، تو ہم تو نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ آپؐ کو۔ ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے اللہ سے کہہ کر عذاب نازل کرا دیجئے۔ تب شاید ہم مان لیں کہ اللہ ہے۔ (طسمٓ الشعراء ع)

اس پر آپؐ نے فرمایا کہ عذاب آنے کے بعد تمہارا ایمان لانا بیکار ہو گا۔ وہ عذاب نہ رکے گا اور تمھاری توبہ بیکار ہو گی۔ دوسرے یہ کہ میں خود تم میں موجود ہوں، اس لئے بھی خدا عذاب نہ نازل کرے گا۔

یہ سُن کر کفار نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک بے آب و گیاہ ہے۔ یہاں اپنے خدا سے کہہ کر ایک دریا جاری کرا دو۔ اور اگر تمہارا خدا ہمارے لئے یہ نہیں کر سکتا تو تم خود اپنا گھر سونے سے بھر لو۔ اس پر آنحضرتؐ کے دل میں یہ تمنّا ہوئی کہ کاش خدا کوئی نشانِ رحمت (معجزۂ رحمت) نازل کر دیتا کہ یہ لوگ اسے مان لیتے۔ لیکن اللہ نے بذریعہ وحی کہا کہ انسان کو عقل و شعور اسی لئے دیا گیا ہے، کہ وہ کائنات و خلق اللہ میں تدبّر و تفکر کرے۔ اُسے جانور نہیں بنایا گیا کہ مجبوراً اپنی فطرت کے مطابق عمل کرے۔ جب ان لوگوں میں ہٹ دھرمی کی یہ حد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے طغیان کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور وجود باری کو نہیں مانتے اور ہزاروں آیاتِ الٰہیہ پر سے اندھوں کی طرح گزر جاتے ہیں گو یا کہ ان کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں، تو اس کے سوا ان کا علاج نہیں کہ یا تو انھیں بجبر مومن بنایا جائے یا دولت کتابیہ قائم کر کے اُن کی بُت پرستی اور تجارت کو ختم کر دیا جائے۔

رسُول اللہؐ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا: رہا یہ معاملہ کہ تم خود چاہتے ہو کہ کوئی آیت (نشان یا معجزہ) دیا جائے تو یاد رکھو کہ اگر تم زمین میں سُرنگ لگا کر گھس جاؤ گے یا آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جاؤ گے۔ تب بھی تمھیں معجزہ نہ دیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ اگر آسمان سے لکھی ہوئی کتاب بھی اُترے تو کافر نہ مانیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو نظر بندی ہے۔

(لو انزلنا علیك كتٰبًا فی قرطاس لقال الذین كفروا ان ھذا الا سحر مبین ٥
وان كبر علیك اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقًا فی الارض
او سلمًا فی السمآء فتاتیھم بایہ .... الانعام)۔ یاد رکھئے کہ آنحضرت ؐ
کو یقین کامل تھا کہ خدا چاہے تو محیر العقول چیزیں (معجزات) دکھا کر یہ ثابت
کر سکتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ لہذا جب کفار کہتے تھے کہ تم پر معجزہ کیوں نہیں
نازل ہوتا! (وقالوا لولا نزل علیہ اٰیۃ من ربہ ط الانعام ع ۴) تو اسی
آیت میں آپ جواب دیتے تھے کہ اللہ آیت (محیر العقول معجزہ) نازل کرنے پر
قادر ہے۔ وہ چاہے تو کر سکتا ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھتے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتا
ذرا آنکھ کھول کے دیکھو کہ جانور اور پرندے سب تمھاری ہی مانند ہیں جو ایک
قانون (کتاب) میں بندھے ہوئے ہیں۔ (قل ان اللہ قادر علی ان ینزل اٰیۃ
ولاكن اكثرھم لا یعلمون ٥ ومامن دابۃ ..... یحشرون ٥ (الانعام ع ۴)
جب تمھیں عقل وشعور دیا جا چکا تو پھر کیوں نہیں دیکھتے کہ خدا خالق ہے۔ تم اور
تمھارے معبود خالق نہیں ہیں۔ تم خلق کرنے سے عاجز ہو۔ یہی آیت
(معجزہ) کافی ہے۔ کسی دوسرے معجزے کی ضرورت (...)۔

مکی سورتوں کی یہ آخری دلیل ہے۔ جس میں اللہ نے صاف صاف انکار
کر دیا ہے کہ کوئی معجزہ اس طرح کا نہ دیا جائے گا جسے دیکھ کر یہ کافر اللہ کے
ہونے کا یقین کریں اور آپ ؐ کو اللہ کا ایلچی مانیں۔

روایات میں معجزات نبوی ؐ: باوجودیکہ قرآن صاف صاف
کہتا ہے کہ رسول اللہ ؐ کو کوئی معجزہ
نہ دیا جائے گا۔ لیکن راویوں نے بہت سے معجزے تصنیف کر لئے اور ہر مولود
کی کتاب کے آخر میں یہ معجزے ملتے ہیں۔ یہ روایتیں نو مسلموں نے گڑھی ہیں۔
اس پر طرہ یہ ہے کہ بعض علماء نے قرآن سے معجزات ثابت کرنے کی
سعی لاحاصل کی ہے۔ مثلاً (۱) شق القمر، (۲) فصاحت قرآن اور (۳) رویائے اسراء۔

اُن کی نظر میں رسول اللہؐ کے معجزے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا، آیت (معجزہ) اللہ کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایسا نشان (آیت) ہوتا ہے جس کے کرنے سے لوگ عاجز ہوتے ہیں اور مان لیتے ہیں کہ ایسی معجز چیزیں کرنے والا سوائے اللہ کے غیر اللہ نہیں ہو سکتا۔

(۱) **شق القمر:** بقول شاہ ولی اللہؒ آیتٌ من آیات اللہ ہے۔ یعنی اللہ کے وجود کا نشان ہے کہ وہ قمر کو بھی شق کر سکتا ہے۔ (یہاں ہم اس حدیث عائشہؓ سے بحث نہیں کرنا چاہتے جس میں اس روایت کی تغلیط کی گئی ہے)

اس کے علاوہ ان "علماء" کو صرف شق القمر ہی کیوں معجزہ معلوم ہوا۔ قرآن میں شروع سے آخر تک خدا کی خالقیت کے جو نشانات (معجزے) درج ہیں انھیں کیوں نہ معجزہ کہا۔ خدا نے عاقرہ کو لڑکا دیا۔ باکرہ سے حضرت عیسےٰ کو پیدا کیا (سورہ مریم) گناہگاروں پر پتھر برسائے (امطرنا علیھم حجارۃ من سجیل الحجر) جانوروں میں دودھ پیدا کیا (ولکم فی الانعام لعبرۃ۔ المؤمنون) مردہ زمین کو بارش سے زندہ کیا (احیاء الارض بعد موتھا۔ یاسین) آسمانوں کو بغیر ستون کے کھڑا کیا (رفع السماوات بغیر عمد۔ الرعد) اور سب سے بڑا معجزہ تو یہ بتایا کہ وہ خالق سماوات والارض ہے جیسا کہ پہلی ہی سورۃ میں بتا دیا۔ الذی خلق۔ یا وَمن اٰیاتہ خلق السماوات و الارض......... ویعلمون الذین یجادلون فی اٰیاتنا مالھم من محیص ۰ (الشوریٰ)۔ یقولون لولا انزل علیہ اٰیۃٌ من اٰیات ربہ۔ وان فی اختلاف اللیل والنھار وما خلق اللہ فی السماوات والارض لاٰیاتٌ لقوم یتقون ۰ (سورۂ یونس)

(۲) **اعجاز قرآن:** بہر حال ایسے علماء بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن میں رسول اللہؐ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں۔ لیکن وہ بھی قرآن کو معجزہ مانتے ہیں اور اسے رسول اللہؐ کا معجزہ کہتے ہیں۔ اس میں شک

نہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن رسول اللہؐ کی تصنیف ہے، تو ہم اسے رسول اللہؐ کا معجزہ کہہ سکتے ہیں اور اس کی فصاحت و بلاغت وجہ اعجاز مانی جاسکتی ہے لیکن یہ خدا کا معجزہ یا آیت اللہ نہیں کہی جاسکتی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر زبان اپنے زمانے کے افکار و واقعات کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتی۔ یعنی ناقص ہوتی ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی یا تنزل کرتا ہے، زبان بھی ترقی یا تنزل پذیر ہوتی رہتی ہے۔ زندہ قوموں کی زبانیں ترقی کرتی رہتی ہیں مگر کسی زبان کو کامل نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ترقی کناں مانی جاسکتی ہے۔ اور اگر امام ولی اللہ محدث دہلوی کی تعبیر کو مانا جائے تو قرآن کے الفاظ نہیں، بلکہ معنی خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ اسی لئے الفاظ کلام عربی بھی دوسری زبانوں کی طرح حادث و ناقص ہیں۔ البتہ معنی قدیم ہیں اور معنوی اعتبار سے یقیناً "کفار قریش کے لئے" قرآن حکیم معجز تھا۔

معجز کے یہ معنی نہیں کہ وہ اگر چاہتے تو قرآن کے مانند عبارت نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ (لونشاء لقلنا مثل ھذا...... قرآن)۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے اور قرآن کو اساطیر الاولین اور سحر کہتے تھے۔ (ھذا اساطیر الاولین ان ھو الا سحر یوثر)۔ اور رسول اللہؐ کو چیلنج دیتے تھے کہ شعر کہو تو ہم قائل ہو جائیں۔ جس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ مَا علمناہُ الشعر وما ینبغی لہ۔ ان ھو الا ذکرٌ و قراٰنٌ مبین ۰ (یاسین) اور اسی کے بعد فرمایا کہ اے رسول تو ان کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہو (فلا یحزنک قولھم)

تب اس تحدی کے کیا معنی ہیں جو قرآن میں بار بار کی گئی ہے کہ اگر تم کو ان باتوں پر شک ہے جو اللہ نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کی ہیں تو تم ان باتوں کی مانند ایک ہی عبارت بنا لاؤ۔ اور اس بات کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کہ جو کچھ تم نے تصنیف کیا ہے وہ قرآنی تعلیم

کی مانند ہے اپنے گواہ بھی لیتے آؤ۔ لیکن یقیناً تم ایسا نہیں کر سکتے:

(ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداء کم ان کنتم صادقین) .... (البقرۃ ۲۳)

ترتیب نزول کے اعتبار سے "تحدی" کے سلسلے میں مندرجہ بالا آیت، آخری آیت ہے۔ سب سے پہلی آیت سورہ طور کی چونتیسویں آیت ہے (فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین ۰ الطور ۳۴) اب آپ صرف اس آیت کو نہ پڑھیں بلکہ سورۂ طور کے آخری رکوع کو جس میں یہ آیت ہے پورا پڑھ جائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اگر یہ تحدی ہے تو صرف قرآن کے لئے نہیں بلکہ توراۃ کے لئے بھی ہے۔ اور اس میں بھی وہی دلیل دی گئی ہے جو "رسول اللہ" ہونے کے ثبوت میں کہا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ہر قوم میں رسول آئے ہیں اُسی طرح میں بھی ایک رسول ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم اہل ذکر سے پوچھ سکتے ہو۔

اسی طرح کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ وہ رسول اللہؐ کو کاہن، مجنون اور شاعر کہتے تھے، قرآن نے کہا کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ پیغام من عند اللہ نہیں ہے بلکہ محمد (صلعم) کی تصنیف ہے۔ تم اس کو نہیں مانتے۔ اگر یہ کلام کاہنوں اور شاعروں کا سا کلام ہے اور تم سچے ہو، تو اس کلام کی مانند ایک بات ہی بنا لاؤ۔ عدم سے وجود میں لانے والے تم نہیں ہو، خدا ہے۔ اُسی نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔ (دیکھئے سورہ طور ۲۹۔۳۷)

اس کے بعد اسی سورہ کی ۸۴ ویں اور ۹۴ ویں آیتوں میں صاف صاف کہ دیا کہ

۸۴۔ فلما جاءھم الحق من عندنا قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ اولم یکفروا بما اوتی موسیٰ من قبل؟

۸۴۔ جب ان کافروں کے پاس ہماری طرف سے حق (قرآن) آیا تو کہنے لگے کہ ویسا کلام کیوں نہیں آیا جیسا کہ موسےٰ لائے تھے؟

قالوا سحران تظاهرا ۞ وقالوا انا لکل کافرون ٥

کیا موسیٰ کے کلام کا پہلے ان لوگوں نے انکار نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰؑ و محمدؐ یا توراۃ و قرآن) ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ہم سب کا انکار کرتے ہیں۔

۴۹- قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدیٰ منھما اتبعہُ ان کنتم صادقین ٥

۴۹- (بہر حال اے رسول) تو ان سے کہہ دے کہ اگر تم لوگ سچے ہو اور توراۃ و قرآن سے زیادہ بہتر ہدایت دینے والی کتاب لا سکتے ہو تو لاؤ، میں تیار ہوں کہ اس کی پیروی کروں۔

پھر اس کے بعد جو آیت ہے وہ بھی سورۃ العلق کی تائید میں ہے کہ عَلَّمَ الانسان مالم یعلم یعنی علم خدا دیتا ہے۔ اور شیطانی علم گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس آیت سے "وحی من عند اللہ" اور "اتباع اھواء" کا تضاد بھی ظاہر ہے۔ یعنی جو بات مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں کہی گئی ہے۔ اور جو بات سورۃ العلق اور سورۃ الناس میں بتائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ خواہشات نفسانی سے جو بات کہی جائے وہ القائے شیطانی ہے اور جو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے وہ منجانب اللہ ہے۔ بہر حال اس آیت پر غور کیجئے:-

۵۰- فان لم یستجیبوا لک، فاعلم انما یتبعون اھواءھم، ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ (الطور)

۵۰- اے رسول اگر وہ توراۃ و قرآن سے بہتر ہدایت کنندہ کتاب نہ لا سکیں، تو جان لے کہ وہ اھواء (شیطان یا نفس امارہ) کی پیروی میں ہیں (صرف شعر و کہانت ہی جانتے ہیں)۔ اور ان سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر خواہشات (شیطانی) کی پیروی کریں (الطور)

سورۂ طور کی اُنچاسویں آیت میں "منہما" کا اشارہ توراۃ و قرآن کی طرف ہے۔ کافروں کے لئے ان کتابوں کو معجز کہا گیا ہے۔ اس آیت کو اُن آیتوں کی روشنی میں پڑھیئے جن میں کتب الہیہ کی تصدیق کی گئی ہے اور انھیں آیات اللہ میں شمار کیا ہے: مثلاً

وقالوا لولا یأتینا بآیۃٍ من ربہٖ اولم تأتھم بینۃُ ما فی الصحف الاولیٰ۔

اور انھوں نے کہا کہ یہ اپنے رب کی کوئی نشانی اپنے ساتھ نہیں لایا۔ (اس کا جواب یہ ہے کہ) کیا اگلی کتابوں کی بینات (یعنی آیات و دلائل) اُن لوگوں کو بار بار نہیں پہنچائی گئیں (کہ توراۃ وغیرہ بھی یہی کہتی ہیں کہ خدا موجود ہے)

اسی سورہ میں دیکھیئے کہ خدا نے آپؐ کو منذر بتایا ہے، ایسا منذر جیسا کہ دوسری قوموں میں ہوتا ہے جو اُنھیں ہدایت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف قرآن توراۃ کی سی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ رسول قرآن بھی ویسے ہی رسول ہیں جیسے کہ رسول توراۃ (حضرت موسیٰؑ) تھے۔

ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ: انما انت منذر ولکل قومٍ ھاد

(سورہ ۱۳-۶) (سورہ ۱۳-۲۶)

کافر کہتے ہیں کہ اس پر (رسولؐ عربی پر) کوئی نشانی کیوں اُتری؟ (ان سے کہہ دو کہ) میں بھی اُسی طرح کا ایک خبردار کرنے والا ہوں جس طرح ہر قوم میں ہادی آتے رہے ہیں (میں کوئی انوکھا ایلچی (بدعاً من الرسل) نہیں ہوں)

کُل کُتبِ الٰہیہ کافروں کے لئے معجز ہیں:

مندرجہ بالا آیات سے ثابت ہے کہ چیلنج کی صورت میں استہزاء اور تکذیب رسول کی ابتدا مشرکین کی طرف سے ہوئی تھی۔ اگر اس دور کی سیرت نبوی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ رسول کریمؐ نے باوجود انتہائی متانت و مُروّت کے جو غضب آلود اور کرخت انداز جواب

اختیار کیا ہے وہ محض خدا کے حکم سے کیا ہے، ورنہ جن حالات میں آپؐ تھے اور جیسے قسی القلب لوگوں میں آپ گھرے ہوئے تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی معمولی انسان ایسے جواب دیتا اور اس کی جان کی خیر رہتی۔ یہ کام تو آنحضرتؐ نے سر بکف ہو کر، اور محض اللہ کے بھروسے پر کیا تھا۔ کہ کہیں انھیں رد در رد جہنم کی آگ سے ڈرایا۔ کہیں انتہائی حریص، طماع، زر پرست، عُتُلّ اور زنیم کہا۔ ظاہر ہے کہ عرب کے لئے اس سے زیادہ رسوا کُن باتیں نہیں کہی جاسکتیں۔ لہٰذا جب کفار نے کہا کہ قرآن بھی شیطانی کلام ہے، تو آنحضرتؐ نے (وحی الٰہی سے) فرمایا کہ اگر واقعی یہ شیطانی کلام ہے تو تم اس کی مانند یا توراۃ کی مانند کوئی کلام بنا لاؤ، اور اگر ممکن ہو تو اس سے بہتر بنا لاؤ میں تیار ہوں کہ اُس کی پیروی کروں۔ دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا نرم کلامی اور شیریں سخنی ہو سکتی ہے۔ کیا یہ چیلنج یا تحدّی ہے؟ یا اس کی ابتدا آنحضرتؐ کی طرف سے ہوئی ہے؟ خدا کا یا رسولؐ کا یہ کام نہیں کہ وہ خدا کے ادنیٰ بندوں کے مقابلے میں لام باندھے اور جیوتی بازی کرے۔ یہ شیوہ تو کفار کا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مفاخرت و منافرت کیا کرتے تھے اور کسی کو پنچ مقرر کر کے اپنے اپنے کارنامے بیان کیا کرتے تھے۔ اور جو شکست کھاتا تھا اُسے مقررہ مال ہارنا پڑتا تھا اور بسا اوقات جلاوطن ہونا پڑتا تھا۔

قرآن کی بہت سی باتوں پر ترتیب نزول کے نہ ہونے اور عربوں کی تاریخ کو ساتھ ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ قرآن نے ان دشمنان دین کے نام بتا کر زندہ جاوید نہیں قرار دئے اس لئے آپ نہیں جانتے کہ وہ کون سے اشرار تھے جنھوں نے تکذیب کی تھی اور وہ کون تھے جو آنحضرتؐ کو بار بار چیلنج کرتے تھے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ بنو امیّہ ان میں سب سے آگے تھے۔ ان ہی کے آباؤ اجداد نے رسول اللہؐ کے آباؤ اجداد ہاشمیہ کو بار بار چیلنج کیا تھا مثلاً:۔

(۱) اُمیہ بن عبد شمس بن عبد الدار نے اپنے چچا ہاشم بن عبد مناف کو منافرت کے لئے چیلنج دیا تب بنو خزاعہ کا ایک کاہن تریج (شاھد) بنا۔ اور اُس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ کیا۔ اُمیہ سو اونٹ ہارا اور دس سال کے لئے جلا وطن کیا گیا۔ (۲) حرب بن امیہ نے عبد المطلب بن ہاشم کو للکارا۔ انھوں نے پہلے تو شاہ حبشہ کو پنچ (شاھد) بنانا چاہا لیکن اس کے انکار پر ایک قریشی حَکم بنا۔ آخر حرب ہارا اور عبد المطلب کی دوستی چھوڑ کر عبد اللہ بن جد عان کا مصاحب بن گیا۔ (یاد رہے کہ یہ وہی حرب ہے جو رسول اللہؐ کے مقابلے میں برابر فوج کی سرداری کرتا رہا۔ اور اس کے بعد اس کے بیٹے ابو سفیانؓ بن حرب نے یہ عہدہ سنبھالا تھا)

غالباً اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ چیلنج کدھر سے تھا اور اس کے جواب میں رسول اللہؐ نے کتنی نرمی برتی تھی کہ ان کافروں سے بار بار کہا کہ آؤ نیکی کی راہ پر چلو اس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ کلام غلط راستہ بتاتا ہے تو تم خود اس کی مانند کلام بناؤ۔ میں اس پر چلنے کو تیار ہوں، اور یہ بھی اجازت دیتا ہوں کہ شہداء یعنی اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے والے بھی تم اپنے ہی گروہ کے آدمیوں کو لاؤ۔

قل ارأیتم ما تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرکٌ فی السماوات إئتونی بکتاب من قبل ھٰذا او اثارۃ من علمٍ ان کنتم صادقین ٥ (سورہ : الاحقاف ۴)

نہ تو تم نے اپنے دیوتاؤں کو دیکھا ہے نہ ایک چیز بھی ایسی دکھا سکتے ہو جو انہوں نے پیدا کی ہو۔ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا علمی یادداشت لاؤ کہ (یہ دیوتا خدا کی خالقیت میں شریک ہیں)۔

کفار کے چیلنج کے جواب میں بار بار قرآن نے بھی کہا کہ یہ ذکر (تعلیم) نہ صرف مجھ پر ایمان لانے والوں کے لئے ہے، بلکہ گذشتہ قوموں میں بھی خدا

کے رسول یہی تعلیم حق لاتے رہے ہیں کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اُسی کی بندگی کرو"۔ لیکن اگر تم اس کو نہیں مانتے تو اپنی بُرہان لاؤ کہ اس "حق" (کتاب" علم" - "اثرۃ من علم") اور اس نصیحت (ذکر) کے علاوہ کسی رسول اللہ کی تعلیم یہ نہیں تھی، بلکہ طاغوت (نفس) پرستی تھی۔

اَمِ اتخذوا من دونہ اٰلِھَۃً ط قل ھاتوا برھانکم ج ھٰذا ذکر من مّعی و ذکر مَن قبلی ط بل اکثرھم لا یعلمون الحقّ لا فھم معرضون ۝ وَمَا ارسلنا من قبلك من رسولٍ الّا نوحی الیہِ انّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلّآ انا فاعبدون ۝ (سورۃ الانبیاء ۲۳-۲۵)

کفار کیوں مثل کلام رحمانی نہ بنا سکے؟

باوجودیکہ کفار کہتے تھے کہ (لو نشاء لقلنا مثل ھٰذا) یعنی اگر ہم چاہیں تو اس کی مانند کلام کہہ سکتے ہیں۔ تو آخر کیا وجہ تھی کہ نہ کہا؟

بات یہ ہے کہ اگر کہتے تو یہی کہتے کہ خدا موجود ہے۔ وہی خالق ہے دوسرا خالق نہیں۔ وہی علم دیتا ہے شیطان علیم نہیں۔ کل قوموں میں اللہ کا راستہ بتانے والے اور طاغوت سے اجتناب کرنے والے آتے رہے ہیں۔ نیکی کرنا اچھا ہے۔ ظلم کرنا بُرا ہے۔ خدا یوم الدین میں جزائے اعمال دے گا۔ اور مرنے کے بعد زندگی یقینی ہے۔

چونکہ وہ ان سب باتوں کے منکر تھے، لہٰذا اگر قرآن یا توراۃ کی مانند کلام تصنیف کرتے تو مسلمان ہو جاتے۔ اس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

اور اگر اس تعلیم کی مانند تصنیف نہیں کرتے تھے (جیسا کہ نہیں کیا باوجودیکہ ان ہی کے شہداء پر اس کا فیصلہ چھوڑا گیا تھا) تو ہارتے تھے غرض ہر طرح سے شکست ہوتی تھی۔ ورنہ عربی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ اب تک ہم کلام جاہلیہ سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور اصول معانی وبیان

میں بھی قرآن نے کلام جاہلیہ کی پیروی کی۔ اور قرآن اُس عربی زبان میں نازل ہوا جو کفا قریش بولتے اور سمجھتے تھے اور جو آنحضرتؐ نے بچپن سے سیکھی تھی۔

اسی طرح مصری نبی مصری، چینی نبی چینی، روسی نبی روسی، انڈونیشیا کے نبی جاوی، ایران کے نبی اوستا یا ایرانی میں خدائی کلام لوگوں کو اپنی اپنی زبانوں میں سناتے تھے۔ ان میں بہت سی کتابیں یعنی تعلیمیں ضائع ہوگئیں۔ خود توراۃ کے اُن نوشتوں کا پتہ نہیں جو حضرت موسیٰ نے طور سینا پر الواح میں مصری زبان درسم الخط میں لکھے تھے۔ نہ اس کے قدیم ترجمے، جو تابوت سکینہ میں محفوظ رکھے جاتے تھے باقی ہیں۔ البتہ توراۃ کے ترجمے یا ترجموں کے ترجمے موجود ہیں۔ اور یہی ترجمے رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی تھے۔ ان ہی کو قرآن نے کتاب اللہ مانا ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شیطانی کلام نہیں ہے۔ اور جو وحی بالمعنی حضرت موسیٰ پر ہوتی تھی وہ ہی ترجموں میں لوگوں نے بیان کی ہے۔ اسی لئے ہم اسے احادیث نبوی (یعنی وحی غیر متلو) کا درجہ دیتے ہیں۔ اور کلام من عند اللہ مانتے ہیں۔ قرآن کے متعلق ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ (بخلاف توراۃ وغیرہ کے) ان ہی لفظوں میں موجود ہے جو رسول اللہؐ نے لوگوں کو سُنائے تھے۔

(۳) اسرا نہ کہ معراج: قرآنی تعلیمات کو نہ سمجھنے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ واقعہ اسراء کو جو ایک رؤیا (خواب) تھا، معراج یعنی آسمان تک بلند ہونا قرار دے دیا۔ ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کریں گے اس لئے کہ قرآن نے خود اس کی تردید کردی ہے، کہ یہ معراج نہیں بلکہ رؤیا تھا۔ یہ رویا جن احوال میں آپ نے دیکھا تھا وہ سیرت نبویؐ کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس کا مقصد بنو اسرائیل سے دوستی کرنا تھا۔

اسی طرح کا ایک رؤیا حدیبیہ جانے سے پہلے بھی آپ نے دیکھا تھا، اور وہ بھی ایک روحانی حقیقت تھی نہ کہ جسمانی عروج الی السماء۔

آیات (معجزات) امور اسبابیہ ہوتے ہیں

گزشتہ نبیوں کے متعلق بھی جن آیات الٰہیہ کا ذکر ہے وہ سب ان قوانین الٰہیہ کی پابندی میں ظہور میں آئے تھے جو خدا نے بنائے ہیں۔ اس لئے معجزات ماننے والوں کا یہ کہنا کہ وہ خارق العادہ (یعنی فطرت الٰہیہ کو پھاڑ ڈالنے والے) ہوتے ہیں غلط ہے۔ خود خدا نے جو قوانین بنائے ہیں وہ نہ خرق ہو سکتے ہیں نہ اُن میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ یہی قرآنی تعلیم ہے (لن تجد لسنّۃ اللّٰہ تحویلاً ولن تجد لسنّۃ اللّٰہ تبدیلا) یعنی جو باتیں عام انسان کو خارق العادہ معلوم ہوتی ہیں وہ خارق العادہ نہیں ہوتیں بلکہ قوانین الٰہیہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ دریا کا پھٹنا، کھٹمل پسّو وغیرہ کا یک بیک کثرت سے پیدا ہو جانا۔ مُردے کا جی اُٹھنا، بغیر آگ کے کسی چیز کا جل اُٹھنا، مٹی سے پودا اور پودے سے رنگ برنگ کے پھولوں کا ظاہر ہونا، چڑیوں کا اُڑنا، بھاری بھاری جہازوں کا سمندر میں نہ ڈوبنا یہ سب قوانین الٰہیہ کے مطابق اور مسبب بہ اسباب ہیں اسی لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی فرماتے ہیں:۔

"فاللہ سبحانہ احدی مجرد من الصفات فی مرتبہ واحدۃ ولحاظ واحد۔ ومقرون بالصفات فی مرتبہ اُخری ولحاظ اٰخر۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس ان مواطن نفس الامر متفاوتۃ منہا مواطن الاسباب، وفیہ العلۃ والمعلول فقط والسبب والمسبب فحسب ومن المتحقق عندنا انہ لم یترک الاسباب قط ولن یترک۔ ولن تجد لسنّۃ اللّٰہ تبدیلا۔ وانما المعجزات والکرامات امور اسبابیہ سوغ علیہا مباینت سائر الاسبابیات"
(التفہیمات الالٰہیہ ص ۵۳)

معجزات بزدلی کی وجہ سے مانگے گئے: جب کسی قوم میں پستی آجاتی ہے اور قوتِ عمل کم ہو جاتی ہے، تو وہ حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح اپنے ہادی سے کہتی ہے کہ جاؤ تم اور تمہارا رب جنگ کر کے فتح کر دو، یہ کام (یعنی جنگ) ہمارے بس کا نہیں ہے۔ (فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون ۵ المائدہ ع ۴)

ظاہر ہے کہ آسمان تک عروج کرانے کی بجائے یہ آسان تھا کہ غار ثور میں تین دن چھپے رہنے کی جگہ آنحضرتؐ کو ہجرت کے وقت چشم زدن میں مدینہ پہنچا دیا ہوتا اور مکڑی کو جالا تننے اور فاختہ کو انڈے دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بلکہ اس سے آسان معجزہ یہ ہوتا کہ منکرین مکہ کی قلب ماہیت ہو جاتی اور رسول اللہ صلعم کو اس عالم کون و فساد میں جلاوطنی کی صعوبت نہ اُٹھانا پڑتی۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی: قرآنی تعلیم ہے کہ سعی و عمل ہی سے انسان اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ وہ دوسری بے عمل اور توہم پرست اقوام کی طرح یہ نہیں چاہتا کہ خدا ان کے بدلے کام کرے اور وہ بے مشقت معجزات و کرامات کے سہارے زندہ رہیں۔ قرآن ایک تعلیم انقلاب ہے۔ وہ صاف صاف معجزات کا منکر ہے اور ایسا انقلاب لانا چاہتا ہے جس میں ہر فرد کی، اور مجموعی حیثیت سے کل دنیا کی قوتِ عمل اور خودی بیدار ہو جائے۔ وہ پہلے اونٹ کا پاؤں مضبوط باندھیں۔ اس کے بعد اللہ پر توکل کریں۔ وہ پہلے خود اعتمادی کے ساتھ عمل کریں اور پھر اتمام اللہ پر چھوڑ دیں یعنی آمنوا و عملوا الصّالحات کے ساتھ ساتھ حق پرستی اور صبر کو اپنا مسلک بنائیں اور موت کو شکست دے کر زندۂ جاوید بن جائیں، اس وقت اللہ اُن کے ساتھ ہوگا۔ (استعینوا بالصّبر والصّلوٰۃ۔ انّ اللّٰہ مع الصّابرین) یعنی اگر تم پہلے سے خود اعتمادی اور صبر کی صفات اپنے اندر نہ پیدا کرو گے تو خدا کبھی تمہارا ساتھ نہ دے گا، نہ جنود اللہ آسمان

سے اُتر کر سکینہ اور اطمینان قلب بخشیں گے۔

غرضکہ قرآن اور دوسری ربّانی تعلیمات صراط مستقیم کی طرف لے جاتی ہیں اور اس پیغام خداوندی کو انسانوں یا جنوں تک پہنچانے والے خدا کے ایلچی یا رسول کہلاتے ہیں۔ یہ خدائی پیغام بالمعنی خدا سے حاصل کر کے مختلف قوموں کی زبانوں کے ذریعے سے ان تک پہنچاتے ہیں۔ یہ رسول اپنی تعلیم کی اُجرت نہیں لیتے۔ ان کی زبان صاف سمجھ میں آنے والی (عربی مبین) ہوتی ہے۔

شیطانی تعلیمات وہ ہیں جو انسان کو گمراہی میں ڈالتی ہیں اور شرک و کفر و ظلم میں مبتلا کر کے انسان کو پستی اور ذلّت کا راستہ دکھاتی ہیں۔ شعرائے عرب کا تفاخر نسب اور قصاص یا خمریات وغیرہ اسی میں داخل ہیں۔ کاہنوں کی غیب گوئیاں اور ساحروں کے سحر بھی شیطانی ہیں۔ یہ لوگ اُجرت لے کر یا معاوضہ کی امید میں اپنا کلام سناتے ہیں۔ ان کی زبان ذو جہتین ہوتی ہے۔ اور ان کا مقصد کچھ نہیں ہوتا (فی کل واد یھیمون)

کلام اللہ اور مسئلہ خلق قرآن: مامون الرشید کے زمانے میں جب خالص عربی افتخار میں آرین فلسفہ اور تصوف نے رخنہ ڈالا۔ اور عربی و عجمی افکار کی آویزش رنگ لائی تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ وحی یا الہام کیا چیز ہے۔ یونان کی دیویاں جو ذی اُس کے تخت کے آگے ناچتی ہیں، یا ایران کا سروش فرشتہ اور ہند کے دیوتاؤں کی آواز جو بے لفظ و صوت ہوتی ہے اور دیو بانی کہلاتی ہے، ان سب نے مل کر یہ سوال اُبھارا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ یعنی قرآن یونانی لوگاس یا کلام یا عقل اوّل کی طرح خود جزو خدا ہے، یا بقول یونانی انجیل کے خود ہی خدا ہے (شروع میں خدا تھا، خدا کے ساتھ کلام تھا، کلام (لوگاس) ہی خدا تھا" انجیل متی) یعنی اگر قرآن مخلوق ہے تو حادث ہونا لازمی ہے۔ اور اگر قدیم ہے تو یہ جزو واجب الوجود ہے یعنی صفات باری میں سے کلام بھی ہے۔

محدثین کلام الٰہی کو قدیم مانتے تھے (ان کے لیڈر امام احمد بن حنبل تھے) اور جو اسے نہ مانے اُسے کافر کہتے تھے۔ امام بخاریؒ نے یہ راہ نکالی تھی کہ قرآن کا تلفظ حادث ہے (یعنی اس کے معانی قدیم ہیں) یہ بھی علمائے لسان عربی کو گراں گزرتا تھا۔ حتے کہ امام احمد کے شاگرد ذہلی اپنے شاگرد امام بخاریؒ سے اسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عربی زبان کو کسی عجمی زبان کے برابر تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ ہر ملک و قوم میں اسی قوم کی زبان میں ہادی آتے رہے ہیں مقصد معانی ہدایت الی اللہ ہے خواہ وہ کسی زبان میں دی جائے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر زبان حادث ہے۔ ورنہ جتنی زبانوں میں خدا کا کلام نازل ہو چکا ہے، سب کو قدیم ماننا پڑے گا اور جب یہ کہا جائے گا کہ قدیم خالدی زبان اب باقی نہیں ہے نہ صحف ابراہیم باقی ہیں، تو ماننا پڑے گا کہ خالدی زبان حادث تھی۔ اسی طرح صحف موسیٰ قدیم مصری زبان میں تھے اور ہیروغلیفی رسم خط میں تھے۔ عرصہ ہوا نہ زبان رہی نہ رسم خط نہ مصری زبان کی توراۃ۔ یعنی صحف ابراہیمؑ و موسےؑ نے اس لئے حدوث کا منہ دیکھا کہ وہ زبانیں ہی زندہ نہ رہیں۔ خود قرآنی عربی اتنی بعید الفہم ہو گئی ہے کہ ہر سال نئی نئی تفسیریں لکھی جا رہی ہیں۔ اسی لئے ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ کتب الٰہیہ کے معانی تو قدیم ہیں اور باقی ہیں، لیکن الفاظ حادث اور فانی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس کسی زبان میں خدا کا کلام یا قانون یا علم بیان کیا جائے وہ خدائی زبان ہے۔ بالفاظ دیگر وہ "خدا کی زبان" نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے بتایا ہے کہ کلام من عند اللہ ورائے حجاب سے نازل ہوتا ہے۔ یہی مسلک امام ولی اللہ دہلوی کا ہے۔

شیطان اور انبیاء

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (حم السجدہ ع ۵)

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی نصِ صریح میں گنجائش تاویل نہیں ہے۔ رسول اللہؐ اور جملہ انبیاء انسان تھے، فرشتہ نہیں تھے اور قرآن کے ذریعے سے کافروں کو بار بار سمجھا چکے تھے کہ نبی انسان ہوتے ہیں فرشتہ نہیں ہوتے۔

قرآن نے شرک کو مٹانے اور انسان سی ناچیز "مخلوق" کو "خالق" کی کارفرمائیوں میں شریک کرنے کے تصوّر کو سورۂ علق ہی میں ختم کر دیا تھا۔ انسان نہ تو خود بخود وجود میں آسکتا ہے نہ اسے سوائے خالق کائنات کی مدد کے حقیقی علم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسےٰ تک جتنے نبیوں کا ذکر ہے سب میں یہی کہا گیا ہے کہ وہ بشر ہیں۔ وہ مجبور ہیں۔ انھیں جو کچھ اختیار ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کیا ہوا ہے اگر وہ اپنے ہوائے نفس سے یعنی شیطان کے القاء اور اس کے بہکانے سے کچھ کریں گے تو اس کے جواب دہ ہوں گے۔ یعنی انھیں جو اختیار بخشا گیا ہے اس کے غلط استعمال پر سزا پائیں گے۔ غرضکہ ہر انسان سے خطا و نسیان کا سرزد ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

قرآن نے شیطان یا اہرمن کا تصور وہی دیا ہے جو دنیا والے اور عرب جانتے تھے۔ وسواس الخناس، ہوائے نفس، یا القائے شیطان اور خطوات الشیطان کے لفظ بھی اسی برائی کی راہ دکھانے والے نفس (امارہ بالسوء) کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن شاہد ہے کہ حضرت آدم کو ابلیس نے دھوکا دیا جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے۔ (فازلھما الشیطان عنھا فاخرجھما مما

کانا فیہ۔ بقرہ: ۳۵) (فوسوس لھما الشیطان لیبدی ما ادری عنھما من سواتھما۔ بقرہ ۲۰) اس پر حضرت آدم و حوا نے توبہ کی اور اعتراف گناہ کیا۔ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین (بقرہ ۲۳) سے یہ بات ثابت ہے۔

نصاریٰ تو یہ مانتے ہیں کہ حضرت آدم نے شیطان کے بہکانے سے جو گناہ کیا تھا وہ بغیر کفارۂ گناہ کے معاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اوپر کی آیت سے ثابت ہے کہ سچے دل سے گناہ کا اعتراف اور پھر اس کا اعادہ نہ کرنے کا عہد (توبہ) اللہ کے نزدیک کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمؑ کے گناہ کے لئے خدا اپنا "بیٹا" بھیجے اور وہ سولی پر چڑھایا جائے۔ قرآن کے نزدیک یہ ظلم ہے کہ جُرم آدمؑ کریں اور سزا مسیح کو ملے۔ اسی لئے قرآن نے صاف کہا ہے کہ جو جرم کرے وہی سزا پائے۔ اور اگر جس کا جُرم کیا ہے اُس سے معافی طلب کرے تو اُسے اختیار ہے کہ معاف کردے۔ لہٰذا وہ جرائم (گناہ) جو اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، توبہ کرنے پر معاف کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ وہ جرائم جو انسانوں سے متعلق ہیں، وہ اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتے جب تک کہ جس کا جرم کیا ہے وہ معاف نہ کرے۔

بہر حال شیطان نے حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک جتنے انبیاء گزرے ہیں سب کو بہکانے کی کوشش کی۔ اسی کو القائے شیطانی کہتے ہیں۔ اسی واسطے رسول اللہؐ کو حکم تھا کہ قرآن پڑھتے وقت خدا کی پناہ مانگ لیا کرو کہ شیطان قریب نہ آسکے۔ پھر یہ بھی قرآن نے بتایا کہ ان مومنوں پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں شیطان کا بس نہیں چل سکتا (فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم ۝ انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربھم یتوکلون ۝ (النحل ۹۸-۹۹) ان عبادی لیس لک علیھم سلطان وکفی بربک وکیلا ۝ (بنی اسرائیل ۶۵)

۵ ؁ نبوی یعنی ابتدائے رسالت میں ایک مرتبہ شیطان نے آنحضرتؐ پر بھی حملہ کیا تھا اور چاہا تھا کہ آپؐ خدا کے ساتھ قریش کی دیویوں اور لات منات اور عزّیٰ کو بھی شفیع مان لیں۔ آپؐ نے تلقائے نفس سے دو جملے پڑھ دئے (تلك الغرانیق العلی - ۲ ان شفاعتهن لترتجی) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ہجرت حبشہ کر گئے تھے وہ واپس آنے لگے۔ لیکن ان لوگوں کو واپسی پر معلوم ہوا کہ فرشتۂ وحی نے آنحضرتؐ کو فوراً ہی بتا دیا تھا کہ یہ جملے اس نے نہیں سکھائے بلکہ خطوات الشیطان یا وسوسۂ شیطانی سے تھے۔ آنحضرتؐ نے اس کا اعلان فوراً کر دیا کہ شفاعت کے معاملہ میں کسی غیر اللہ سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور جتنے غیر اللہ معبود ہیں وہ حصب جہنم ہیں۔ پھر مکہ فتح ہو چکا اور اوپر والے جملوں کے واقعے کو سولہ سترہ سال گزر چکے۔ تو آپؐ ۹ ؁ میں مکہ تشریف لائے۔ لوگوں کو وہ بات اب تک یاد تھی تو خدا نے وحی نازل فرمائی۔ اور اسی سلسلے میں خدا نے فرمایا کہ شیطان نے پہلے بھی اس طرح کی شرارتیں کی ہیں :-

۵۱ - وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنّی القی الشیطان فی امنیته. فینسخ الله ما یلقی الشیطان ثم یحکم الله ایاته والله علیم حکیم ۝

۵۱ - اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے جب تمنائیں کی ہوں تو شیطان نے اُن آرزوؤں میں القا نہ کیا ہو لیکن اللہ القائے شیطان کو منسوخ کر دیتا ہے اور پھر اپنے احکام کو مضبوط کر دیتا ہے اس لئے کہ وہی علیم و حکیم ہے (شیطان نہیں ہے)

۵۲ - لیجعل ما یلقی الشیطان فتنة للذین فی قلوبهم مرض والقاسیة قلوبهم (المائدۃ)

۵۲ - پھر جن لوگوں کے دلوں میں مرض اور قساوت ہوتی ان کے لئے رسولؐ کی یہ آرزوئیں جو القائے شیطانی سے ہونے کے بعد منسوخ کر دی گئی ہیں، فتنہ بن جاتی ہیں۔

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی سورۃ الحدید نازل ہوئی تھی۔ مندرجہ بالا آیات سے پہلے قرآن میں آچکا تھا کہ

وان کادوا لیفتنونك عن الذی اوحینا الیك لتفتری علینا غیرہٗ فاذا لاتخذ وك خلیلاًo

قریب تھا کہ شیاطین قریش تجھے اس وحی سے پھیر دیتے جو خدا نے کی تھی اور تو دوسری باتیں خدا کی طرف منسوب کر دیتا اگر تو ایسا کرتا تو خدا اپنی دوستی سے تجھے خارج کر دیتا۔

اور پھر ان آیات کے بعد سخت وعید ہے کہ اے رسول اگر تو نے خطوات الشیطان پر عمل کیا ہوتا تو ہم زندگی میں اور مرنے کے بعد دونوں حالتوں میں تجھ پر دُگنا عذاب کرتے۔

بہرحال یہ آنحضرتؐ کی علوئے مرتبت کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے القائے شیطانی کے بعد بھی اُن باتوں پر عمل نہ کیا اور خدا کے کرم سے محفوظ رہے اور صاف اعلان کر دیا کہ یہ میری کمزوری تھی۔ آخر میں بھی "بشر" ہوں۔ جب ابوالانبیاء شر شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے تو کسی اور انسان کا خطا و نسیان میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ البتہ جو انسان خطا کرے اور توبہ کر لے وہی مقبول بندہ ہے۔ اسی واسطے قرآن نے بہت سے نبیوں کی زبانی اس بات کا اعتراف کرایا ہے کہ انہوں نے اقرار گناہ کیا اور کہا (انی کنت من الظالمین) یا (ربنا ظلمنا انفسنا) خود حضرت موسیٰ جیسے اولی العزم نبی کے حال میں ہے "نسیان" حکم الٰہی بھی شیطان کے القاء سے ہوتا ہے (فانی نسیت الحوت ط وما انسانیہ الا الشیطان ان اذکرہٗ ۔سورۃ الکھف ۶۲)

بہرحال ترتیب نزول قرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو القائے شیطان کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور نہ تو انبیاء کو اتنا بلند کرتا ہے کہ وہ دیوتا بن جائیں نہ عام انسانوں کو خطا کاری کے عوض جہنمی قرار دیتا ہے بلکہ رحمت الٰہی کا دروازہ خطاکاروں کے لئے زیادہ رحمت و رافت کے ساتھ کھلتا ہے بشرطیکہ وہ اجتناب گناہان کا صدق دلی سے عہد کریں۔

توراۃ وانجیل وغیرہ محرف نہیں، یہ کلام من عند اللہ ہیں

القرآن مصدق لما معھم۔ قرآن توراۃ وانجیل وغیرہ کی تصدیق کرتا ہے۔
بعض "یہود تحریف لفظی کر کے اصل معنی کو بدلنا چاہتے ہیں"

توراۃ اور دوسری ربانی تعلیمات کو قرآن "الکتاب" کہتا ہے اور بار بار اُن کی تصدیق کرتا ہے۔ مصدقاً لما بین یدیہ، وما انزل من قبلک سے یہی مراد ہے

مثلاً:- ۱- یا اھل الکتاب لستم علی شئ حتی تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم

اے اہل کتاب اگر تم توراۃ وانجیل اور قرآن کو نہ قائم کرو (یا ان پر عمل نہ کرو) تو تم بالکل بے اصولے ہو جاؤ گے۔

۲- قل فأتوا بالتوراۃ واتلوھا ان کنتم صادقین ۝

اے رسولؐ ان یہودیوں سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو تورات لائیں اور اُسے پڑھ کے سنائیں۔

۳- انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی ونور یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء۔ (المائدہ ع ۷)

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت و نور ہے۔ اس کے مطابق وہ بنی یہود کے لئے فیصلے کیا کرتے تھے جو حکم ماننے والے (مسلم) تھے۔ اور حکم کرتے تھے ربانی (درویش) اور علماء (احبار) اس لئے کہ وہ محافظ بنائے گئے تھے کتاب اللہ (توراۃ) پر۔ اور وہ اس کی نگہبانی پر مقرر تھے۔ (المائدہ ع ۷)

۴- ولیحکم اھل الانجیل بما

اور عیسائیوں کو چاہیے کہ اس قانون

انزل اللہ فیہ، ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون، (المائدہ ع ۷)

کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اُتارا ہے اور جو اللہ کے قانون (توراۃ) کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ نافرمان ہے۔ (المائدہ ع ۷)

۵۔ ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم منھم اُمۃً مقتصدۃ وکثیر منھم ساء ما یعملون ۰ (المائدہ ع ۹)

۵۔ اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو خدا کے یہاں سے نازل ہوا ہے (یعنی قرآن) کو قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے (یعنی خدا کے انعامات پاتے)۔ ان میں کچھ لوگ سیدھی راہ پر ہیں اور بہت سے بدراہ ہیں (المائدہ ع ۹)

۶۔ یاایھا الذین اوتوا الکتاب اٰمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

۶۔ اے اہل کتاب تم اس قرآن پر ایمان لاؤ جو تمہاری تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے۔

اس سلسلے میں حدیث بخاریؒ ہے کہ:۔

عن عبد اللہؓ بن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلعم بلّغوا عنّی ولو اٰیۃ۔ وحدّثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج۔ ومن کذب علی متعمدا فلیتبوّا مقعدہ فی النار۔

(رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ میری طرف پہنچاؤ خواہ وہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔ اور بنو اسرائیل سے ذکر کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ اپنی جگہ آگ میں بنائے گا۔ (بخاری)

ترجمہ حضرت عبد اللہؓ بن سلام کے سلسلے میں علّامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابن سلام بنو اسرائیل کے بہت بڑے عالم (حبر) تھے۔ آپ مسلمان ہو گئے اور آنحضرتؐ سے توراۃ پڑھنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا

کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو، اور دوسری رات توراۃ پڑھا کرو۔ (اقرأ هذه لیلہ وهذا اللیلہ)

ابن حزم نے لکھا ہے کہ ہم توراۃ وانجیل کا انکار نہیں کرتے بلکہ جو ان کا انکار کرے اس کو کافر سمجھتے ہیں (نحن لم انکرهما قط، بل نکفر من انکرهما) ہم کہتے ہیں کہ توراۃ موسیٰ، زبور داؤد، انجیل عیسےٰ، صحف ابراہیم وموسیٰ، اور وہ کتابیں جن کا نام نہیں بتایا گیا نہ نبیوں کے نام بتائے گئے (کتباً لم یسم لنا علی انبیاء لم یسموا لنا) یہ سب حق ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کفار بنو اسرائیل نے تورات وزبور کو بدل دیا ہے اور کمی زیادتی کردی ہے ان میں بعض باتیں خدا نے بطور حجت الزامی کے باقی رکھی ہیں (وابقی الله بعضها حجة کما شاء) اسی طرح کفار نصاریٰ نے بھی کیا ہے۔ باقی کتابوں کو اللہ نے اٹھا لیا ہے۔ (ابن حزم۔ ملل والنحل۔ ج۔۱۔ ص ۱۵۷-۱۵۸)

یہود تحریف لفظی کرتے ہیں:

ابن حزم کا آخری قول ان نصوص کے قطعی خلاف ہے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اُن کی غلطی کی بنیاد اُن آیتوں پر ہے جن میں تحریف وتبدیل کلمات کا ذکر ہے: مثلاً اخراج یہود اور قتل بنو قریظہ کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ "یہودیوں کا ایک فریق (وانّ منهم لفریقاً یلوٗن السنتهم۔۔۔۔ آل عمران ع ۸) ایسا ہے جو توراۃ کو زبان اٹھلا کر پڑھتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ یہ الکتاب (توراۃ) ہے، لیکن درحقیقت وہ توراۃ نہیں ہوتی۔ وہ جھوٹ کہتے ہیں کہ یہ توراۃ ہے"۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہود بعض ایسی عبارتیں پڑھتے تھے جو توراۃ کی نہیں ہوتی تھیں۔ جملہ یہود کے لئے یہ نہیں کہا گیا۔ صرف ایک فریق کے لئے کہا گیا۔ اسی سورہ میں آگے کہا گیا ہے کہ سب یہودی برابر نہیں (لیسوا سواءً ع ۱۲) ان یہودیوں میں ایک فرقہ ایسا ہے جو راہ راست پر ہے۔ وہ لوگ راتوں کو توراۃ پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں (من اهل الکتاب امة قائمة

یتلون آیات اللّٰہ آناء اللیل وھم یسجدون ٥) اس کے آگے اور بھی تعریف یہود ہے۔

ترتیب نزول کے اعتبار سے سورۂ نساء میں اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا کہ (من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وّراعنا، لیّاً بالسنتھم وطعناً فی الدین) یعنی یہود نے کلمات کو اٹھلا کر بولنا اپنا وطیرہ بنالیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ کلمات توراۃ کے نہیں ہوتے۔ عام بول چال میں وہ اس طرح زبان اٹھلا کر تحریف کلمات کرتے ہیں کہ سمعنا واطعنا کو سمعنا وعصینا کہتے ہیں اور انظرنا کہنے کی جگہ راعنا کہتے ہیں۔ تاکہ بظاہر معلوم ہو کہ ٹھیک لفظ بول رہے ہیں۔ مگر وہ زبان اٹھلانے کی وجہ سے بُرے لفظ بن جاتے ہیں وہ بعض الفاظ توراۃ کو بھی اٹھلا کر اس لئے بولتے ہیں کہ ان کا مفہوم بدل جائے۔ (فارقلیط)

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس سے بہت پہلے جب آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے اور یہود ومسلم معاہدے کی رو سے یہ دونوں ایک "امّت واحدہ" بن گئے تھے اور ان دونوں کے سرپنچ (حکَم) آنحضرتؐ قرار پائے تھے۔ اس وقت سے منافقین یہود کی یہ حالت تھی کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب تنہا ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ توراۃ میں جو تصدیق نبویؐ ہے اس کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سلسلے میں قرآن نے بتایا ہے کہ یہ یہود تو وہ ہیں کہ ان میں ایک فریق ایسا تھا جو کلام اللّٰہ (توراۃ) کو سنتا تھا اور اسے پوری طرح سمجھ لینے کے بعد بھی جان بوجھ کر اس میں تحریف کرتا تھا۔ یعنی بولتے وقت اُن لفظوں کو زبان سے اول بدل کر بولتا تھا تاکہ جو حکم ہے وہ نہ ماننے بلکہ محرف لفظ کی پابندی کرے۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ ایک گروہ ایسا تھا کہ عام بول چال ہی میں نہیں اپنی کتاب کے لفظوں میں بولتے

وقت ہیر پھیر کرتا تھا۔ (دیکھئے افتطمعون ان یومنوا لکم وقد کان فریق یسمعون کلام اللہ ثم یحرّفونہٗ من بعد ما عقلوہ، وھم یعلمون۝ البقرہ ع ۹) اسی کے آگے ہے کہ "ان میں بعض اُمّی ہیں یعنی "نادان" ہیں وہ "الکتاب" (توراۃ کے قانون) سے واقف نہیں۔ وہ صرف اپنی خودساختہ خواہشات میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہم میں مبتلا ہیں"۔ (ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الّا امانیّ وان ھم الّا یظنّون) اسی کے بعد فرمایا کہ "ان یہودیوں پر افسوس ہے جو اپنی طرف بعض چیزیں الکتاب کے نام سے (تالمود۔ یا مشنع۔ یا تاریخ قدیم) لکھتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ پھر اس فریب سے تھوڑا سا روپیہ کما لیتے ہیں۔ اس کتابت اور اس کمائی دونوں پر لعنت ہے"۔ (فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم، ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً ط فویل لھم ممّا کتبت ایدیھم وویل لھم ممّا یکسبون۝ البقرہ ع ۹) بات یہ ہے کہ یہودی فقیہ اس طرح کے قوانین (کتب) تصنیف کیا کرتے تھے جن کے ذریعے سے امرا کو توراۃ کے احکام سے چھٹکارا مل جائے۔ اور پھر یہ کہتے تھے کہ یہ باتیں توراۃ سے ماخوذ ہیں بلکہ خود کلام اللہ ہیں۔ اس طرح جھوٹے فتووں پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ علمائے سوء ہر زمانے میں یہی کرتے رہے ہیں۔

قرآن عہد نامۂ قدیم کو میثاق بنی اسرائیل کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصلی میثاق یہ تھا کہ سوائے اللہ کے کسی کی بندگی نہ کرو اور احکام عشرہ پر عمل کرو۔ اُسی کو تم نے توڑ دیا (واذا اخذنا میثاق بنی اسرائیل الخ۔ بقرہ ع ۹) پھر جب اس میثاق کی تصدیق کرنے والا قرآن آیا تو تم کہنے لگے کہ جو احکام ہم پر اترے ہیں (یعنی توراۃ اور خود نوشتہ تالمود) کو تو ہم مانیں گے اس کے علاوہ جو کچھ ہے (یعنی قرآن نے توراۃ

کی سخت آیتوں کو بدلا ہے) اُسے ہم نہ مانیں گے (قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ ... بقرہ ع ۱۰) اور ان میں سے ایک فریق نے رسول اللہؐ اور قرآن کو، جو مصدق توراۃ ہیں، ماننے سے انکار کر دیا۔ (ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریقٌ من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون ٥ بقرہ۔ ۱۲)۔

بہرحال باوجودیکہ یہودی جانتے تھے کہ آپؐ رسول اللہ ہیں اور توراۃ میں بھی ایک نبی کے آنے کی خبر تھی، لیکن وہ "فارقلیط" کے لفظ کو الٹا کر بولتے تھے، یا اُن آیتوں کو چھپاتے تھے جن میں آمد فارقلیط کا ذکر تھا اس لئے قرآن نے کہا کہ (الذین اٰتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم ط وان فریقاً منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون ٥ بقرہ ع ۱۷) اسی کے آگے قرآن نے کہا کہ (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیّنّٰہ للناس فی الکتاب، اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللّٰعنون۔۔۔۔ بقرہ ع ۱۸) یہاں بھی توراۃ کو ہدایت والی الکتاب کہا ہے۔ اور جو لوگ اس کی ہدایت اور اللہ کے رسول کی آمد وغیرہ کی آیتوں کو چھپاتے ہیں اُن پر لعنت بھیجی ہے۔

ان یہودیوں کی حالت یہاں تک خراب ہو گئی ہے کہ میثاق بنی اسرائیل (عہدنامۂ قدیم یا توراۃ) کے برخلاف جبت وطاغوت (بت اور شیطان) کو پوجتے ہیں یعنی شرک بھی کرتے ہیں اور مشرکین کی طرح کہانت وسحر بھی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کافروں کو مسلمانوں سے بہتر بتاتے ہیں (الم تر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت ویقولون للذین کفروا ھٰؤلاء اھدیٰ من الذین اٰمنوا سبیلا ٥ النساء ع ۷) اور ان کی دنائت کی انتہا ہو گئی ہے کہ یہ منافقت سے ایمان لاتے ہیں تاکہ

کفار کی جاسوسی کریں۔ اور کلمات کو ان کے اصلی تلفظ سے ادا نہیں کرتے۔ بلکہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے فارقلیط یا ایسے ہی دوسرے الفاظ کو (جن کا اوپر ذکر ہوا) اٹھلا اٹھلا کر بولتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ہماری مصنوعی کتاب اللہ (تالمود وغیرہ۔ یا محرف الفاظ) کی مانند قرآن میں آیات آئیں تو انھیں تو ہم مان لیں گے، اور اگر ان کے خلاف ہو تو نہ مانیں گے۔ یہ جھوٹے، حرام خور جاسوس ہیں۔ (ومن الذین ھادوا سمّاعون الکذب سمّاعون لقوم اٰخرین لم یاتوک ۙ یحرّفون الکلم من بعد مواضعہٖ ۚ ویقولون ان اوتیتم ھٰذا فخذوہ وان لم توتوہ فاحذروا ...... (المائدۃ ٦)

غرضکہ قرآن سے ثابت ہے کہ توراۃ و انجیل وغیرہ نور و ہدایت ہیں محرف نہیں ہیں۔ یہودیوں کی ایک جماعت حق کو نہیں چھپاتی۔ توراۃ پڑھتی ہے۔ ایک فریق ایسا بھی ہے جو حق کو چھپاتا ہے، اور ایسے لفظ محرّف کر کے بولتا ہے جو توراۃ کے نہیں ہیں نہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ یہ جاسوس اور سود خوروں کی جماعت ہے۔ یعنی اصلی توراۃ و انجیل اچھے یہودیوں اور نصرانیوں کے پاس ہے اور محرّف نہیں ہے۔ ان کتب الٰہیہ میں نہ تو تحریف لفظی ہے نہ معنوی۔ اس لئے کہ یہ تعلیمیں اللہ کی طرف سے ہیں، شیطانی نہیں ہیں۔ البتہ جو لوگ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے مثل توراۃ کے ہے وہ جھوٹے ہیں۔ وہ اُنھوں نے اپنے تلقائے نفس سے روپیہ کمانے کو لکھا ہے لہٰذا وہ شیطانی ہیں۔

اسلامی احکام کی حکمت

(یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَة)

ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآنی زبان میں الکتاب کے معنی قانون زندگی یا علم کے ہیں۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قانون یا علم بھی سکھاتا ہے، اور اس قانون کی حکمت یا غایت بھی بتاتا ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر قوم میں ہادی آچکے ہیں اور اسلام یعنی طاعت الٰہی کی تعلیم دے چکے ہیں۔ عربی زبان بولنے والوں کے لئے آسان اور سمجھنے میں آنے والی زبان عربی تھی لہٰذا ان کے لئے کتاب وحکمت کی تعلیم عربی زبان میں دی گئی (لعلکم تعقلون)۔ یہ عجیب بات ہوتی کہ عربوں کے سامنے فارسی یا لاتینی زبان میں اوستا اور بائبل کی طرح تعلیم دی جاتی اسی واسطے قرآن نے کہا کہ عربوں کے لئے عربی زبان ہی ہوسکتی ہے (أأعجمیّ وعربی؟)۔ لہٰذا:۔

۱۔ قرآن کا ترجمہ ہر زبان میں ہونا چاہیئے تاکہ لوگ قوانین الٰہیہ کی حکمت کو سمجھ کر اُس پر عمل کرسکیں۔

۲۔ اگر وہ عربی زبان نہ جانتے ہوں تو وہ اپنی نماز میں بھی اپنی اپنی زبانوں میں پڑھیں، ورنہ قرآن کی حکمت میں تدبّر و تفکّر نہ کرسکیں گے۔ (افلا یتدبرون القرآن؟ افلا یتفکرون؟)

ہم یہاں اس بحث کو نہیں شروع کرنا چاہتے کہ کس طرح بنواُمیہ کے عربی افتخار نے عجمیوں کو اپنی زبان میں قرآن اور اسلام کو سمجھنے سے روکا۔ البتہ یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ آخرکار فارسی زبان اسلامی زبان بن گئی اور

مثنوی رومی کو قرآن زبان پہلوی مانا گیا۔ امیر خسروؒ نے فارسی کو عربی سے بہتر کہا خانوادۂ ولی اللہی نے اردو سے ہندی کو بلند کیا۔ اور شاہ فضل الرحمانؒ گنج مراد آبادی نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر ہندوستان میں قرآن نازل ہوتا تو بھاشا میں ہوتا۔ (دیکھئے ترجمۂ سور قرانیہ در بھاشا: از شاہ فضل الرحمانؒ گنج مراد آبادی)

اگر ہم احکام اسلام کی حکمت کو جانے بغیر ان پر عمل کریں تو ایک رسم تو ادا ہو جائے گی لیکن اس کا مقصد یا مفاد حاصل نہ ہو گا۔ عمل سے پہلے مقصد کا متعین کرنا ضروری ہے۔ ورنہ عمل تو ہو گا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اسی کو فعل عبث کہتے ہیں۔

سیرت نبویؐ کو ترتیب نزول قرآن کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے ہر عمل کی حکمت و غایت نمایاں ہو جاتی ہے۔ آخرہ و اولی، ہدایت و ضلال، حق و باطل، نور و ظلمت، فنا و بقائے دوام، اور جزائے اعمال کی حقیقت سیرت نبویؐ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے کہ جنھیں ہم عبادات کہتے ہیں وہ در حقیقت ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا وجود میں نہیں آسکتا۔ لہذا یہ بحث ہی فضول ہے کہ ایمان کے بغیر عمل یا عمل کے بغیر ایمان کی کیا حیثیت ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اگر ہم احکام اسلام کی تاریخ پر اُن کے نفاذ کی ترتیب کے ساتھ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی حکمت و غایت یہ تھی کہ ایسی انقلابی جماعت بنائی جائے جو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جان و مال سے تیار ہو۔ پھر یہ حزب اللہ ایسی دولت کتابیہ قائم کرے جس میں سب کتابی متحد ہو کر طاغوت پرستی کو ختم کر دیں۔ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ سب اسی مجاہدے اور جہاد فی سبیل اللہ کی منزل کے درمیانی نشانات راہ ہیں اور ایک ہی مقصد و غایت کے لئے بنائے گئے ہیں۔

مثلاً :۔

۱۔ صلوٰۃ

قرآن کے مکی دور میں صلوٰۃ کے معنی سلام، خوش اخلاقی، فریضہ انسانی یا دھرم کے ہیں۔ یہ قدیم سامی لفظ یورپ میں بھی سلام، سجدہ اور تعظیمی بوسے کے معنوں میں "صلیوت" ہی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح دین۔ دھرم اور دنیا سب طریقہ زندگی یا فرض منصبی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ نماز فرض ہونے سے پہلے، یعنی سنہ نبوی تک جب قرآن کا روئے سخن کفار مکہ کی طرف تھا تو اس لفظ سے نماز مراد نہیں تھی۔ ہمارے بعض مترجمین اس لفظ کے معنی ہر جگہ نماز کر دیتے ہیں اور یہ نہیں خیال کرتے کہ مخاطب کون ہے۔ اور ترتیب نزول کے مطابق کس زمانے کی آیت ہے: مثلاً

(۱) الا المصلین ۝ الذین ھم علیٰ صلوٰتھم دائمون ۝ (وہ دین دار جو اپنے فرائض پر قائم ہیں) المعارج

(۲) وذکر اسم ربہٖ فصلّٰی ۝ (اور اس نے اپنے رب کو یاد کرنے کے بعد اپنا فرض انجام دیا) الاعلیٰ

(۳) فصلّ لربّک وانحر ۝ (اپنے رب کے بتائے ہوئے فرائض ادا کر اور نحر کر کے بھوکوں کو کھلا) الکوثر

(۴) فویلٌ للمصلّین الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون ۝ (ان لوگوں پر خرابی ہو جو اپنے فرض سے بے خبر ہیں) الماعون

(۵) قالوا لم نک من المصلّین ۝ ولم نک نطعم المسکین ۝ (مجرم بولے کہ ہم اپنا فرض اطعام مسکین نہ ادا کرتے تھے) المدثر

(۶) فلا صدّق ولا صلّی ۝ ولٰکن کذّب وتولّٰی ۝ (نہ اس نے تصدیق کی نہ سلام کیا بخلاف اس کے تکذیب کی اور منہ موڑ لیا) القیامہ

(۷) ارأیت الذی ینھٰی عبداً اذا صلّٰی ..... او امر بالتقویٰ ۝ (اس شخص

کی شرارت تو دیکھو کہ جب وہ بندہ (یعنی رسول اللہؐ) اپنے آقا کی خدمت بجا لاتا ہے تو وہ منع کرتا ہے..... یا اگر گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے، تو وہ رد کرتا ہے) العلق۔

تبلیغ اسلام کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں صلاۃ جن فحشاء و منکر سے بچاتی تھی وہ کیا تھیں، غلاموں، مقروضوں، عورتوں اور بے کسوں پر جو مظالم ہوتے تھے ان کا شمار فحشاء میں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شرک افلاس سے زیادہ منکر (گھناؤنی) کیا چیزیں ہو سکتی ہیں۔ العلق سے والمرسلات تک کا وہ زمانہ ہے جس میں دو مرتبہ کفار قریش کے وفود ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روکو ورنہ ہم یا تو اسے قتل کر ڈالیں گے، یا بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں کو دشمن قرار دے دیں گے۔ والضحیٰ، الم نشرح، العلق، الفیل، القدر، قریش، واللیل، والعادیات، زلزال، والعصر، التکاثر، القارعہ، الناس، اذا الشمس، الھمزہ، المعارج، عبس، البلد، والفجر، الاعلیٰ، الکوثر، الماعون، اللھب، الطارق، المزمل، والتین، الانشقاق، انفطار اور والمرسلات کو پڑھ ڈالیے۔ سب میں صلوٰۃ کا یہی مفہوم ہے کہ اطعام مسکین کرو۔ ظلم سے باز آؤ۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد بھی پناہ نہ ملے گی یعنی دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے اور اکل مال بالباطل کی سزا پاؤ گے۔

مظلوموں کو صلوٰۃ کی یہ تعلیم تھی کہ ارباب من دون اللہ کے خلاف بغاوت کر دو، اور صرف اُس رب کے بندے بنو جو تمہارے بھلے ہی کے لئے تم کو علم دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس کے سوا تمہارا کوئی آقا نہیں۔ بہر حال رسول اللہؐ مختلف ادوار تبلیغ اسلام میں مختلف سورتوں کے ذریعے سے مختلف اقوام کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ اور صلات کا مقصد تو ایک ہی رہا لیکن طریقے بدلتے رہے۔

مکہ میں نماز کا طریقہ یہ تھا کہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر آپؐ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ کفار قریش کی طرف سے علانیہ، بالجہر قرآن پڑھنے کی سخت مخالفت تھی، حتیٰ کہ آپؐ نے رد سے سخن نصارائے حبشہ کی طرف کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شعب ابی طالب میں جانا پڑا۔ اور جو مسلمان ہجرت کر سکتے تھے وہ حبشہ چلے گئے۔ تین سال تک شعب کی سختیاں جھیلنے کے بعد جب آپ ۱۰ سنہ نبوی میں شعب سے رہا ہوئے تو اسرار کا خواب دیکھا اور اسی زمانے میں جملہ مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ استعانت بالحق کیا کرو۔ اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کیا کرو۔ یہ صلوٰۃ حزب اللہ کی فتحمندی کے لئے خدا سے استعانت کی دُعا تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عمل یہ تھا کہ سب مسلمان مکہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کو اپنا مرکز عمل بنانے کی کوشش میں تھے۔

نماز باجماعت: ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ میں حزب اللہ کا مرکز بنا اور مسلمانوں نے مسجد بنائی اور جماعت کے ساتھ اپنے مقصد یعنی نور کی ظلمت پر فتح کے لئے اللہ سے دُعا (صلوٰۃ) باجماعت شروع کر دی۔ اس کے بعد ایسا زمانہ آیا کہ نمازوں میں دُعائے قنوت بھی پڑھی گئی۔ (اسی لئے حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اسے جزو قرآن سمجھتے ہیں) اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جب انا فتحنا پڑھی گئی۔ غرضکہ نماز کی نوعیت مختلف زمانوں میں مختلف رہی۔ اس لئے اگر صحیح طور پر سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھی جائے تو مختلف احوال میں صلوٰۃ کی مختلف صورتیں ہو جائیں گی۔

غرضکہ صلوٰۃ کے دو بڑے مقصد ہیں :-

(۱) اللہ کو مان کر اپنی جماعت میں خود اعتمادی پیدا کرنا۔

(۲) دنیا سے خوف وجوع کو ختم کرنے کے لئے خدا سے مدد مانگ کر جہاد کرنا۔

۲۔ صوم : روزہ

جس طرح نماز، انسان میں خود اعتمادی پیدا کر کے حصول مقصد کا ذریعہ بنتی ہے، اُسی طرح روزہ بھی انسانیت کو خوف و جوع سے بچاتا ہے، اور دولت کتابیہ کے قیام کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی روزے رکھے جاتے تھے اور اُن کی مختلف غرضیں تھیں۔ مثلاً ہندو اپنے مُردوں کے سوگ میں روزے رکھتے ہیں اور مُردے کو جلانے کے وقت تک کھانا نہیں کھاتے۔ (مُسلمان بھی دفن تک فاقہ کرتے ہیں) اور اس طرح اُن کے لئے اظہار غم کرتے ہیں۔ بابل کی قید کے زمانے میں یہودیوں نے بھی یروشلم کے محاصرہ اور تباہی کے غم میں چار دن کے روزے رکھنا شروع کر دئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت علیؓ اور اُن کے فرزندوں کے ماتم میں روزے رکھتی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اظہار غم کے لئے (ہندوؤں کی طرح) عرب عورتوں میں بھی سر مُنڈانے کی رسم جاری تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی وفات پر بیسیوں عورتوں نے اپنے بال مُنڈوا کر اُن کی قبر پر چڑھا دئے تھے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بعد وفات نبوی اپنے بال مُنڈوا رکھے تھے۔

نصرانی بھی حضرت مسیح کے چالیس گھنٹے قبر میں رہنے کی یاد میں چالیس گھنٹے کا روزہ ایسٹر میں رکھتے ہیں۔ بعد میں یہ روزہ چالیس دن کا کر دیا گیا۔

روزوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کسی مذہبی رسم (جیسے بپتسمہ) یا قربانی کرنے سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ رسم ہے کہ عید قرباں کے دن حضرت ابراہیمؑ کے قربانی کے روزے کی یاد میں قربانی کرنے کے وقت تک روزہ رکھتے ہیں۔

روزہ عموماً نفس کشی کے لئے رکھا جاتا ہے اسی لئے یونان کے کلبی و رواقی فلسفی بھی اس کی ہدایت کرتے تھے۔ یہودی ہر ہفتہ میں دوشنبہ اور جمعرات کو، اور نصرانی چارشنبہ اور جمعہ کو روزے رکھتے ہیں۔ اور ہندوؤں میں ہلال اور بدھ کے دنوں میں روزے رکھتے ہیں۔ (مُسلمان بھی ایام بیض کے روزے رکھتے ہیں)

عام خیال ہے کہ روزے کے ذریعے جو جسمانی کمزوری پیدا کی جاتی ہے اُس سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ اور روحانی طاقت حاصل کر کے انسان وبا، سحر، قحط، مفلسی اور موت کو دور کر سکتا ہے۔ ہندو سنیاسیوں میں یہ تصور عام ہے اور وہ عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کوئی کانٹوں پر سوتا ہے کوئی ننگا رہتا ہے، کوئی ہاتھ کو کھڑا کر کے سُکھا دیتا ہے۔ کوئی عمر بھر چُپ رہتا ہے۔ اور بعضے تو اپنی زبان کاٹ کر دیوی پر چڑھا دیتے ہیں۔ لیکن گوتم بدھ نے سالہا سال تک ان طریقوں پر عمل کیا اور جب کچھ نتیجہ نہ نِکلا تو ان پر یہ روشن ہوا کہ جسم کو اذیت دینا بے کار ہے۔ اصل طریق عمل اعتدال کا رستہ ہے۔ نہ زیادہ کھاؤ کہ ہیضہ ہو جائے اور نہ کم کھاؤ کہ جسم ہی معطل ہو جائے اسی لئے زرد اُشتر نے بھی روزہ رکھ کر جسم کو کمزور کرنا ایک گناہ عظیم قرار دیا۔ اور فرمایا کہ "اہرمن" سے لڑنا ہے تو خدا کی نعمتوں کو استعمال کر کے جسم کو مضبوط بناؤ۔ لہذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ جسمانی کمزوری بڑھانے سے روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ اسلام بھی اس قسم کے روزے کو منع کرتا ہے۔ اسی لئے روزوں کا زمانہ سردیوں یعنی دسمبر کے لئے مخصوص ہے۔

حضرت مسیحؑ خود روزے رکھتے تھے (لوقا $\frac{۲}{۴}$) اور اُنھوں نے روزوں کا حکم بھی دیا تھا۔ پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ روزہ نمائش کے لئے رکھنا درست نہیں۔ (متی $\frac{۶}{۱۶}$) نصرانی بھی اُن کے چالیس دن رات کے روزوں کی یاد میں عید میلاد مسیحؑ کے موقع پر اسی لئے روزے رکھتے ہیں کہ شیطان کے بہکانے میں

نہ آئیں، اور حضرت مسیحؑ کی طرح یہ کہہ سکیں کہ "انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔ زندگی کے لئے کلمات اللہ کی مدد کی ضرورت ہے۔" (متی ۴)

صوم عاشورا ۱ھ: جب ہجرت مدینہ کے بعد رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہودی "یوم توبہ" کو صوم عاشورہ رکھتے ہیں۔ یہ مہینہ اعتدال خریفی کے قریب ستمبر اکتوبر میں ہوا کرتا ہے۔ یہی مہینہ یعنی "تشرین" فلسطینی یہودیوں کا پہلا مہینہ ہوتا تھا۔ اسی مہینہ کو اہل حبشہ مسکرم کہتے ہیں۔ اور نیا سال اس کی پہلی تاریخ سے شروع کرتے ہیں۔ عربوں میں چونکہ نسی کی رسم جاری تھی اور وہ تین سال بعد ایک لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری سال کو شمسی بنالیا کرتے تھے اس لئے یہودی تشرین اور عربی رجب ایک ہی ساتھ شروع ہوتے تھے ۱ھ میں جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورۂ تشرین (رجب) کو یوم توبہ مناتے ہیں تو آپ نے بھی اس دن روزہ رکھا مقصد یہ تھا کہ یہودی محسوس کریں کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔

ترتیب قرآن اور صوم رمضان ۲ھ: لیکن جب آنحضرتؐ نے دیکھا کہ باوجود معاہدہ ہونے کے ابن جحشؓ کے قتال کی وجہ سے یہود مخالفت پر آمادہ ہیں تو نہ صرف آپ نے بیت المقدس کے قبلہ کو ترک کر کے قبلہ اول (کعبہ) کی طرف قبلہ بنا دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ صوم عاشورا فرض نہیں ہے بلکہ صوم شہر رمضان کو فرض کر دیا۔

حکمت و پس منظر رمضان ۲ھ: قرآن کے ہر حکم (کتاب) میں ایک مقصد (حکمت) مضمر ہے۔ اس لئے حکمت صوم کے لئے اگر آپ صوم رمضان ۲ھ کے زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس زمانے میں مسلمان مہاجرین کو ہر قسم کے سامان کی ضرورت تھی۔ خوراک، لباس، اسلحہ، باربرداری کے اونٹ، سواری گھوڑے اتنے بھی نہیں تھے کہ تین سو تیرہ بدریوں کو کفایت کر سکتے۔ یہی زمانہ تھا جب انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا تھا اور یہی زمانہ تھا جب لوگوں کو روزہ رکھ کر خوراک بچانے اور اپنے مسکین ساتھیوں کا پیٹ بھرنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں آجکل کی سی بے عملی کی حالت نہ تھی کہ ایک مسلمان کھاتا اور دوسرا بھوکا مرتا۔ یا ایک فدیہ دیکر روزہ سے بچ جاتا اور دوسرا باوجود ضعف جسمانی کے روزہ رکھنے پر مجبور ہوتا۔

رمضان جاڑوں میں ہونا چاہیئے یہی سُنّتِ رسولؐ ہے!

شعبان ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ اس سے پہلے یہودیوں سے آنحضرتؐ دفاعی معاہدہ کر چکے تھے، اور ان سے دوستی کی بہت کوشش کی تھی۔ حتی کہ عاشورے کا روزہ بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن حضرمی کے قتل کے بعد یہودی اتنے خوش ہوئے اور مسلمانوں پر آوازے کسنے لگے کہ خدا نے تحویل قبلہ کا حکم دیا اور یروشلم سے جو یہودی قبلہ تھا، منہ پھیر کر ابراہیمی قبلہ یعنی کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز کا حکم ہوا۔ اس پر منافق یہودی مسجد نبویؐ سے نکل گئے اور کہنے لگے کہ آیات اللہ (احکام الٰہی) میں تبدل و تنسیخ ہو رہی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آیت (حکم) تحویل قبلہ نہ تبدیل حکم الٰہی ہے نہ تنسیخ، بلکہ جو بدعت یہودیوں نے یروشلم کو قبلہ بنا کر شروع کر دی ہے اس کی جگہ پہلے بیت اللہ یعنی کعبہ کو قبلہ بنانے کا بہتر حکم (آیت) ہے۔ اسی طرح اونٹ کو حلال سمجھنے کا بھی حکم ہے۔ یہ حکم تالمود کی خودساختہ آیت کو منسوخ کر کے اصلی دین ابراہیمی کا رستہ بتاتا ہے۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کی حقیقت:۔

غرضکہ اُس زمانے میں جبکہ یہودیوں پر قرآنی انداز شروع ہو گیا تھا، آنحضرتؐ نے یہ خدائی حکم سُنایا کہ ہمیں وہ روزے رکھنا چاہئیں جو ہم سے پہلے کے اہل کتاب (یعنی نصاریٰ) رکھتے تھے۔ یہ روزے متعدد تھے۔ چالیس دن کے روزے ۱۵۔ نومبر سے ۲۵۔ دسمبر تک ولادت مسیحؑ کی خوشی میں رکھے جاتے تھے! اسی طرح چالیس دن کے روزے وفات مسیح کے سلسلے میں ایسٹر (EASTER)۔ کے زمانے میں رکھے جاتے تھے۔ چونکہ قرآن کے نزدیک وفاتِ مسیحؑ سے زیادہ اہم ولادتِ مسیحؑ تھی اور اسی کے اختتام پر مسیحی دنیا میں جشن ولادتِ مسیح منایا جاتا تھا

اس لئے آنحضرتؐ نے ۲ھ سے ۸ھ تک رمضان کے روزے ۱۵۔نومبر سے ۲۵۔دسمبر تک کے زمانے میں رکھے۔یادرہے کہ اہل عرب بھی شمسی تقویم کے پابند تھے اور ہر تیسرے سال لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری سال کو شمسی بنا لیتے تھے اس لئے رمضان کا مہینہ ہمیشہ جاڑوں میں ہوا کرتا تھا۔اور غار حرا پر جب آنحضرتؐ تحنث یا تخنف فرمایا کرتے تھے تو اُس وقت بھی ۱۷۔رمضان کو قرآن کا نزول جاڑوں ہی کے موسم میں ہوا تھا۔اب آپ پر "کتب علی الذین من قبلکم" کی حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جس طرح نصاریٰ رمضان کے روزے (۱۵۔نومبر سے ۲۵۔دسمبر کے اندر کے مہینہ میں) رکھتے ہیں اُسی طرح مسلمانوں کو بھی روزے رکھنا چاہئیں۔تاکہ یہود کے نزدیک بنو نصرانی کافر تھے ان کو مسلمان دوست بنالیں اور دوسرے ملکوں کے نصرانی بھی شاہ حبشہ کی طرح مسلمانوں سے برادرانہ سلوک کریں۔چونکہ اس زمانے میں دن بہت چھوٹے اور ٹھنڈے ہوتے ہیں اسی لئے بدر کے سفر جہاد میں آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھے۔جس کا جی نہ چاہے وہ سفر اور مرض کی رعایت سے فائدہ اُٹھالے۔لیکن یہ یاد رکھے کہ روزہ بہرحال ادا کرنا پڑے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے (یطیقونہ) وہ فدیہ یعنی صدقہ دیا کریں جو کم از کم ایک مسکین کے کھانے کی برابر ہو۔غرضکہ (فدیہ دے کر) تطوع خیر کرنا ایک فرد کے لئے (خیر لہٗ) بہتر ہے۔لیکن اگر تم سب (اجتماعی طور پر) روزہ رکھو، تو اس میں تم سب کا بھلا (خیر لکم) ہے۔کافی خوراک بچے گی اور کوئی بھوکا نہ رہے گا۔اور غزوات کی تیاری میں مدد ملے گی۔

فدیہ صوم:۔ وعلی الذین یطیقونہٗ فدیۃ طعام مسکین (اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے (یعنی بوجہ ضعفِ جسمانی روزہ

ان کی طاقت سے باہر ہے) وہ ایک مسکین کا کھانا ضرور دیں۔ اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ مقصد صوم خوراک کو بچانا تھا۔ روزہ رکھو گے تب بھی خوراک بچے گی اور نہ رکھو گے تب بھی بچے گی۔ اگر روزہ رکھو گے تو جو خوراک بچے گی وہ خود تم پر صرف ہوگی اور اگر روزہ نہ رکھو گے تو ہر روزے کے بدلے میں بھی وہی کرنا ہوگا کہ خوراک بچاؤ گے اور اپنے ایک مسکین بھائی کو کھلاؤ گے۔ گویا روزہ رکھنا خود ایک قسم کا صدقہ بھی تھا، فدیہ بھی تھا اور انفاق بھی تھا۔

فدیہ، صدقہ، انفاق: یاد رہے کہ ابھی دولت کتابیہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں سے "حزب اللہ" کے مقاصد کے لئے انفاق کی تاکید ہی کی جا سکتی تھی۔ اسی لئے سورہ بقرہ میں "مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ" سے مُراد خوش دلی سے چندۂ جہاد دینے کے ہیں۔ دیکھئے سورۂ بقرہ (۱۹۶) میں صوم کو صدقہ کے برابر بتایا ہے۔

فمن كان منكم مريضاً أو به اذًى من رأسه ففدية من صيامٍ او صدقةٍ او نُسُكٍ ط

اگر حج کے بعد کوئی سر نہ منڈا سکے مرض یا سر کی بیماری کی وجہ سے تو وہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا لذائذ سے پرہیز کرے۔

اسی طرح انفاق بھی جہاد مالی (صدقہ) کا درجہ رکھتا ہے اور جہادِ جانی کے برابر ہے:۔

ليس على الضعفاء ولا على المرضى ولا على الذين لا يجدون ما ينفقون حرج، اذا نصحوا لله ورسوله (سورۂ توبہ ۹۰)

کمزور۔ مریض اور وہ لوگ جو مسکنت کی وجہ سے انفاق کرنے سے معذور ہیں (اور جہاد میں جان یا مال سے کسی طرح شریک نہیں ہو سکتے) تو ان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ خدا و رسولؐ کی محبت ہی دل میں رکھیں۔

بہرحال روزہ ہو، فدیہ ہو، صدقہ ہو یا انفاق ہو سب کا مطلب اللہ اور رسولؐ کی محبت میں جان مال اور اپنے خیالات کو لگا دینا ہے۔ اور ان سب کا مقصد قیام دولت کتابیہ ہے۔ تاکہ دنیا خوف اور جوع سے بچ کر ترقی کر سکے۔

صوم اور نُسک: نسک جمع ہے نسیکہ کی۔ اس کی ایک جمع نسائک بھی ہے۔ نسیکہ قربانی کو کہتے ہیں۔ قربانی کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلایا جائے۔ جیسا کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ میں نحر کے معنی صدقہ کے ہیں۔ اگر نُسک کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ قربانی یعنی صدقہ کے لیئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ گویا اس آیت میں دو ہم معنی لفظ استعمال ہوئے۔ لیکن اگر اُس مریض مؤمن کا لحاظ رکھا جائے جو نہ روزے رکھ سکتا ہے، نہ صدقہ دے سکتا ہے، نہ قربانی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو اس کے نسک سے مراد اس لفظ کے دوسرے معنی ہوں گے یعنی پارسا شدن یا پرہیزگاری و زہد و عبادت کردن۔ یہاں یہ نوٹ کر لیجیے کہ اقوام عالم میں سنیاس اور زہد و تنسک کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان میں تقلیل غذا اور لذائذ سے پرہیز اور عبادات کی کثرت کے ساتھ ساتھ زاہدانہ، عابدانہ و راہبانہ زندگی اختیار کی جاتی ہے حتےٰ کہ جین مذہب والے فاقہ کر کے مر جانا روا رکھتے ہیں۔ نصاریٰ میں روزہ کی ایک قسم نُسک بھی ہے۔ یعنی کسی ایک قسم کے گوشت کو نہیں کھاتے اور اسے روزہ کہتے ہیں۔ ہم نے نسک کے معنی "لذائذ سے پرہیز" لکھے ہیں۔

اسلامی تقویم کو شمسی ہونا چاہیئے

انما عدۃ الشہور عند اللہ اثنا عشر شھرا۔ اللہ کے قانون کے مطابق شمسی سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے۔

جس طرح اہل کتاب کی پیروی میں رمضان کو ۱۵۔ نومبر سے ۲۵۔ دسمبر تک کے زمانے میں ہونا چاہیئے، اسی طرح حج بھی اس طرح ہونا چاہیئے کہ اہل کتاب اس زمانے میں حج یا مذہبی میلہ کرتے ہوں۔ یہ یاد رہے کہ جب رمضان دسمبر میں ہوگا تو ذی الحجہ کا مارچ میں ہونا ناگزیر ہے۔ (کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم)

دنیا کے ہر ملک میں اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کے موقع پر، جبکہ دن رات برابر ہو جاتے ہیں، موسمی میلے ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں ان میلوں میں نہ صرف تجارتی مال لوگوں تک پہنچتا تھا، بلکہ لوگوں کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا بھی مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ تیر اندازی۔ گھوڑ دوڑ، کشتی، شعر و سخن، خطابت، موسیقی، مے نوشی و عیش پرستی کے ساتھ ساتھ پرستش و عبادت بھی ہوا کرتی تھی اور لوگ امن و امان سے سفر بھی کر سکتے تھے۔ جنگ اور قصاص کے دیوتا اپنے غصے کو کم کر دیتے تھے۔ اور ربیع و خریف کی بہار کے زمانے میں ہر جگہ نوروز کی خوشی میں عید منائی جاتی تھی۔

عرب میں ربیع کے میلے کو حج اکبر اور خریف کے میلے کو حج اصغر کہتے تھے اسی لئے ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینوں میں حج اکبر (بڑے میلے) کے زمانے میں قتل و غارت گری حرام تھی۔ اور حج اصغر یعنی چھوٹے میلے میں جو رجب میں ہوا کرتا تھا، صرف ایک مہینہ امن عام کا اعلان ہوتا تھا۔

حج کے میلوں کی حکمت و غایت

جس طرح صلوٰۃ کی حکمت خوف و جوع کے دور کرنے کیلئے دولت کتابیہ

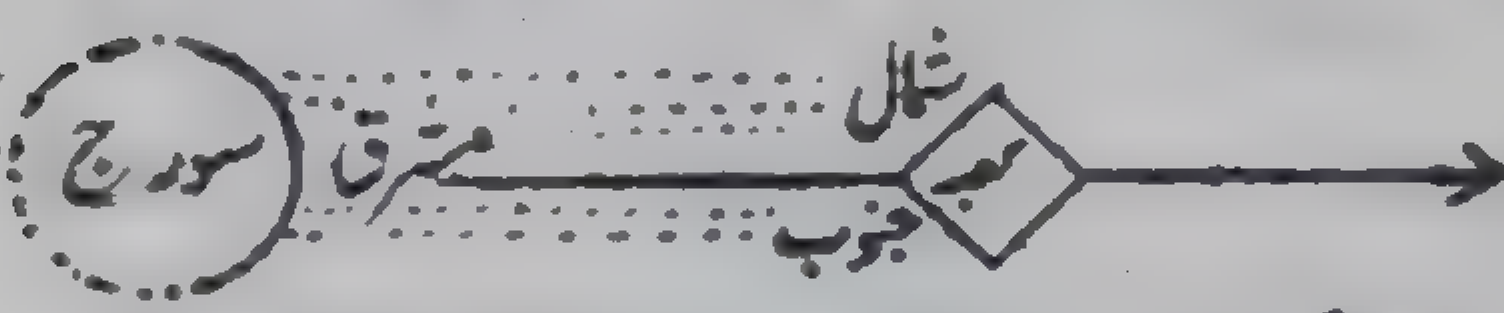
کی تیاری ہے۔ اُسی طرح حج ایک قومی کانفرنس ہے جس میں "منافع للناس" سے مراد سیاسی، تمدنی اور تجارتی منافع ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قبائل کے میل جول اور جسمانی و ذہنی مقابلوں اور تفریحوں کا بھی موقع پیدا ہو جاتا ہے۔ حج اکبر سے پہلے اور اس کے بعد ذوالمجنہ، ذوالمجاز اور عکاظ میں میلوں کا ایک سلسلہ قائم تھا اور کل عرب کے قبائل دوسرے ملکوں کے تاجروں سے مل کر مادّی مصنوعات اور ذہنی تخلیقوں کا تبادلہ کیا کرتے تھے اسی زمانے میں مفاخرت و منافرت بھی ہوتی تھی۔ اسلام نے اس تفاخر بالآباء کو ختم کر دیا، ذکر اللہ اور تجارت کا حکم دیا۔ اور بتایا کہ مشرکوں کو روک دینے سے یہ نہ ڈرو کہ تم مفلس ہو جاؤ گے۔ اللہ اپنے فضل سے تمھیں غنی کر دے گا۔ (وان خفتم عیلة فسوف یغنیکم اللہ) (التوبہ)

موسمی حجوں کے لئے قرآنی اشارے: قرآن حکیم میں موسمی حجوں کے متعلق بہت سے اشارے ہیں، جن سے صاف ثابت ہے کہ حج کے لئے بھی روزوں کی طرح مخصوص موسم ہے :-

(۱) سورۃ القریش سے ثابت ہے کہ ذی الحجہ کے حج اکبر اور رجب کے حج اصغر کے زمانے، گرمی اور سردی کے موسموں میں ہوا کرتے تھے۔ حجوں کے بعد یہ رحلتیں ہوتی تھیں۔ (حج اکبر میں دھوپ بڑھنی تھی اسی لئے یہ ایام تشریق تھے)

(۲) سورہ رحمان سے ثابت ہے کہ سورج کے دو مشرق اور دو مغرب (مشرقین ومغربین) ہیں۔ خدا کے حکم سے کعبۃ اللہ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس طرح بنایا ہے کہ اُس کا ایک کونا مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف ہے۔ اور جب موسم اعتدال پر آتا ہے تو سورج کی شعاعیں براہ راست حجر اسود پر پڑتی ہیں۔ گرمیوں میں سورج شمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شمالی دیوار کعبہ کو روشن کرتا ہے، سردیوں میں یمین (جنوب) کی طرف مائل ہوتا ہے اور رکن یمانی کو روشن کرتا ہے۔ اس طرح چھے مہینے جنوب مشرق سے اور چھے مہینے شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ گویا اُس کے مشرقین (دو مشرق) اور مغربین ہوتے ہیں۔ قریش اس سے واقف تھے اور اسی لئے

انکا قلمس (ناسئی الشہور) حج کے بعد مقام منیٰ پر اعلان کیا کرتا تھا کہ آئندہ سال حج اکبر محرم میں ہوگا۔ معہذا کسی مشرک نے حسب عادت "رب المشرقین والمغربین" پر استہزا نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ سال میں اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کے اعتبار سے جاڑوں کا مشرق الگ اور گرمیوں کا مشرق الگ ہوتا ہے۔ گویا مشرقین و مغربین کی حقیقت اُن پر روشن تھی۔



اس کے علاوہ جنتری بنانے والے ناسئی الشہور حضرت اسماعیلؑ کے زمانے سے برابر چلے آتے تھے۔ عدنان اول، قیدار بن اسماعیلؑ کی اڑتیسویں پشت میں تھا اس کے زمانے میں نسئی کا عہدہ قائم تھا۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے تک باقی رہا۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ عُرفہ (خالدیہ) کے باشندے تھے۔ وہاں کواکب پرستی، خصوصیت سے شمس (بعل) پرستی رائج تھی۔ اُن کے معبد رصد گاہوں کا کام دیتے تھے جن سے مشارق و مغارب نجوم بھی معلوم کئے جاتے تھے۔ بابل میں ان کے کھنڈر موجود ہیں۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کواکب پرستی سے منحرف ہو کر رب المشارق والمغارب کے بندے بن گئے تھے اس لئے اُنہوں نے جو بیت اللہ بنایا، اُس میں صنعت تو رصد گاہ کی رکھی، لیکن طواف کا رُخ بدل دیا۔ شمس پرست اب تک سورج کی گردش کی سمت یعنی جنوب سے شمال کی طرف اپنے بتوں کا طواف کرتے ہیں۔ لیکن سنّتِ ابراہیمی یہ ہے کہ شمال سے جنوب (بائیں سے دائیں) طواف ہو تاکہ ثابت ہو کہ ہم شمس پرست نہیں، خدا پرست ہیں۔ اسی لئے اگرچہ یمین (دایاں۔ دکھن) اور شمال (بایاں۔ بام) کا قدیم سامی تصور سورج کے اعتبار سے سامی و آرین زبانوں میں اب تک قائم ہے اور اصحاب الیمین (دکھن اچاری = راست رو) اور اصحاب الشمال (بام مارگی = چپ رو) کے محاورے بھی باقی ہیں، لیکن ہند میں طواف (پری کرما) کا طریقہ اُلٹا ہے۔ جو قدیم شمس پرستی کی یادگار ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ کعبہ کی

بتعمیر یقیناً ابراہیمی ہے اور اس کی جنوبی و شمالی دیواریں رصد گاہی اصول پر بنی ہیں۔

مختلف ملکوں کے نوروز اور میلے:

بابل اور ایران میں نوروز ۲۱۔ مارچ کے قریب ہندستانی ہولی کی طرح سورج کی آمد آمد کا تہوار تھا۔ اسی طرح جاڑے دن کی ابتدا میں ۲۱۔ستمبر کے قریب ایران میں نیم سردہ اور ہند میں دسہرہ (دیوالی) اب تک جاری ہے ان ہی موسموں کو اہل عرب موسم حج (ذی الحجہ) اور رجب (بیچ کا مہینہ) قرار دے کر میلے تہوار (حج اور عید) منایا کرتے تھے۔ اور ان ہی مہینوں میں یہودی عیدیں ہوتی تھیں۔ ان کا نوروز فلسطینی ۲۱۔ ستمبر کے قریب ہوتا ہے، اسی مہینہ تشرین کی ۱۰۔ تاریخ کو یہودی "یوم تزبہ" یا عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ جسے آنحضرت نے بھی سنہ ۱ھ میں رکھا تھا۔ ۲۱۔ ستمبر ہی سے حبشہ والوں کا نوروز میسکرم کے مہینے سے شروع ہوتا تھا، اور اب بھی ہوتا ہے۔ یہودیوں کا بابلی نوروز نیساں کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ۲۱۔ مارچ کے قریب ہوتا ہے اور اعتدال ربیعی سے شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں حضرت مسیحؑ فلسطین آئے تھے۔ اور بقول نصرانیاں انھیں سولی دی گئی تھی، اور وہ تین دن کے بعد جی اٹھے تھے لہذا وہ بھی یہودیوں کی طرح عید فصح EASTER (ایسٹر) مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی غلامی کے زمانے میں جو بھیڑ کا بچہ یہودیوں نے ذبح کیا تھا وہ درحقیقت "مسیح بن اللہ" تھا۔ اُس کے خون کے نشانات کو دیکھ کر خدا کا فرشتہ اُن کے گھروں کو چھوڑ کر گزر (Passed-over) گیا تھا اور مصریوں کے پلوٹھی کے بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ غرضکہ اسی موسم میں یہودی و نصرانی دونوں عید فصح مناتے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ چاند کی ۱۴۔ تاریخ کو جو ۲۱۔ مارچ کے بعد آئے اس میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ عجیب اس لئے ہے کہ ہند میں دسہرہ اور عرب میں ایام تشریق اسی زمانے

میں ہوتے ہیں۔ اور ہر جگہ قربانی کی رسم بھی انجام دی جاتی ہے۔ البتہ عرب میں ۱۲ سنہ ھ سے قمری تقویم جاری ہوئی۔ اس کی وجہ سے حج کے مہینے بدلتے رہتے ہیں اور حج اعتدال کے موسموں میں نہیں ہوتے۔

آیت نسی: قرآن میں آیت نسی (انما عدۃ شھور عند اللہ اثنا عشر شھراً) سے ثابت ہے کہ موسمی سال کے بارہ مہینے ہونا چاہئیں۔

عرب جاہلیہ، اہل ہند کی طرح تیسرے سال ایک لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری مہینوں کے سال کو شمسی سال کے برابر کر لیا کرتے تھے۔ قرآن نے حکم دیا کہ یہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں، وہی بارہ مہینے رکھے جائیں۔ یہاں یہ یاد رکھئے کہ سال (یعنی حول سنہ یا عام) کو ہمیشہ موسمی سال مانا جاتا ہے۔ جب کہ ایک موسم گردش کر کے پھر اُسی نقطہ پر آجائے۔ یعنی سنہ یا حول کا تعلق سورج کی گردش سے ہے اور سال کے بارہ مہینے صرف اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ یا تو رومی تقویم کو مانا جائے یا ایرانی تقویم کی مانند کوئی طریقہ ایجاد کیا جائے۔ جولین کلنڈر اب بدل کر گریگورین ہو گیا ہے لہٰذا موسموں کا تعین اس کے حساب سے کر کے اس زمانے میں جب کہ یہودی و نصرانی و ایرانی و ہندی عید نوروز یا عید فصح مناتے ہیں اُسی زمانے میں عید حج اکبر بھی رکھی جائے۔ یہ کام بہت آسان ہے۔

مسلمانوں نے اپنی فصلی جنتری چند سال کے تجربے کے بعد ہی بدل دی تھی کاش اہل علم جمع ہو کر بالاتفاق (بالاجماع) یہ فیصلہ کر دیں کہ حج اکبر اعتدال ربیعی میں، حج اصغر (رجب) اعتدال خریفی میں، اور رمضان نومبر دسمبر میں ہوا کرے گا۔ تو کتابیوں سے تعلقات بھی بڑھ جائیں۔ منشائے خداوندی بھی پورا ہو جائے اور سنت رسولؐ بھی ادا ہوتی رہے۔ یہی نہیں بلکہ موسموں کی سختی کے زمانے میں جو ہزاروں جانیں روزہ اور حج کی وجہ سے جاتی ہیں وہ بھی بچ جائیں اور منشائے حج یعنی منافع للناس، تجارت اور سالانہ اسلامی کانفرنس بھی

بڑی دھوم دھام سے ہو۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس تبدیلی کے بعد جو لوگ اللہ والے ہیں (خواہ وہ کسی ملک وملت سے تعلق رکھتے ہوں) وہ سب رفتہ رفتہ قبلہ ابراہیمی کو اپنا قبلہ مان کر اسلامی عیدیں شریک ہوں گے، اور اسلام کے پیغام امن پر عمل کرکے صرف چار مہینوں کو نہیں بلکہ سال کے بارہ مہینوں کو حرام تسلیم کرلیں گے۔

یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ آنحضرتؐ نے جو حج کیا تھا اس میں فرمایا تھا کہ زمانہ گردش کرکے پھر اسی نقطہ پر آگیا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلا حج کیا تھا۔ عام الوداع سنہ ۱۰ھ کا ماہ ذی الحجہ ۲۸۔ فروری سنہ ۶۳۲ء سے شروع ہوا تھا۔ یعنی ۹۔ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ۔ ۹۔ مارچ سنہ ۶۳۲ء کا دن اعتدال ربیعی سے گیارہ دن پہلے تھا۔ اس سال سے لوند کا مہینہ بڑھانے کی رسم تو ختم کردی گئی، لیکن حول یا عام کو بارہ شمسی مہینوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ بہرحال اب بھی اسلامی تقویم کی بالاجماع درستی ہو سکتی ہے جس سے دنیا کو نفع پہنچ سکتا ہے اور ہزاروں حاجی سردی یا گرمی کی شدت سے بچ کر عالمی کانفرنس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اس کی تبلیغ ہر مسلمان پر فرض ہے، وہ یہ ہے:-

"(ایہا الناس) انما النسیء زیادۃ فی الکفر، یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ (ویحرموا ما احل اللہ) وان الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق

لوگو نسئی (لوند کا مہینہ ہٹا دینا) کفر کے زمانے کی بڑھائی ہوئی بات ہے کافر اس سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اسی مہینے کو کسی سال قتال کے لئے حلال کرلیتے ہیں اور کسی سال حرام کر دیتے ہیں۔ اس طرح حرام (ادب کے) مہینوں کی گنتی تو پوری کر دیتے ہیں لیکن نتیجہ

الله السماوات والارض)
انّ عدة الشهور عند الله
اثنا عشر شهراً في كتاب الله
يوم خلق السماوات والارض
منها اربعة حرم (ثلاثة
متوالية ورجب مضر الذي
بين جمادى وشعبان) فاذا
انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا
المشركين (التوبة)

یہ ہوتا ہے کہ جو مہینہ اللہ نے حرام کیا ہے وہ حلال بنا لیتے ہیں (اور جس مہینہ میں قتال جائز ہے اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ بہرحال آج کا دن وہ دن ہے جبکہ زمانہ اور موسم گردش کر کے اسی نقطہ پر آ گیا ہے جس پر خلق کائنات کے وقت تھا) اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہیں۔ یہی اللہ کا قانون ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرام (ادب کے) ہیں (جن میں مشرکوں سے بھی قتال نہیں کر سکتے) تین مہینے تو پے در پے ہیں (ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم) اور چوتھا مہینہ رجب کا ہے جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے۔ ان چار مہینوں کے علاوہ مشرکین سے قتال جائز ہے۔

حرفِ آخر:

دنیا میں لادینیت بڑھ رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو دین سے ناواقف ہیں، یا اس کے متعلق غلط نظریات بنا چکے ہیں۔ اس لادینیت اور الحاد کی تمام تر ذمہ داری اُن کج فہموں پر ہے، جو دین کی حقیقت کو نہ سمجھنے کے باوجود اس کے علم بردار بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ سائنس اور دین یعنی عقل و الہام میں تضاد ہے۔

ہر دین میں برہمنوں یا پوپوں کی جماعتیں موجود ہیں۔ اور وہی اپنے اپنے دینوں کو جس رنگ سے پیش کرنا چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور سب کو مجبوراً ان کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس اسلام نے کلیسائیت اور برہمنیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، خود اُسی اسلام میں اتنی ملل و نحل پیدا ہو گئی ہیں، اور اتنی تحزب و فرقہ بندی بڑھ گئی ہے کہ بات بات میں اپنوں ہی کی تکفیر ہوتی ہے۔ گویا وہ مسلمان جو کل دنیا کو مومن و شاکر بنانے آیا تھا، خود کتابیوں اور مومنوں کو امّی اور خاسر بنا رہا ہے۔ اب نوبت یہ آ گئی ہے کہ علمائے سوء کی خود ساختہ روایات کے خلاف اگر کتاب اللہ بھی پیش کی جائے تو ان کے نزدیک وہ قابلِ قبول نہیں، اور پیش کرنے والا ان کے عقیدے میں کافر ہے۔

اگر کوئی قرآن سے یہ ثابت کرے کہ اس کی بیسیوں آیتیں تو کیا، ایک بھی منسوخ نہیں تو وہ کافر۔ اگر کوئی سینکڑوں آیتوں کو مشتبہ المراد نہ تسلیم کرے تو وہ منکر۔ اگر وہ حروف مقطعات، سورۂ تحریم، سکینہ و جنود اللہ، اور بیسیوں آیتوں کو قرآن ہی سے غیر مبہم ثابت کرے تو وہ جاہل۔ اگر وہ قرآن کی یہ آیت پڑھے کہ ﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا، وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ﴾ (سورۃ النور ع ۲)

اور یہ کہ رسول کریمؐ کو حضرت عائشہ صدیقہ پر قطعی کسی قسم کا شک شبہ نہ تھا، بلکہ انھیں تو یہ توقع تھی کہ مومنین و مومنات سُنتے ہی کہہ دیں گے کہ یہ صریح تہمت (افک مبین) ہے۔ پھر باوجود اس نص صریح کے اگر وہ اُن روایات کا انکار کرے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ شبہ میں تھے تو وہ منکر حدیث اور مدلس قرآن۔ غرضکہ اگر کوئی قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھے کہ (یارَبِّ اِنَّ قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا) اور تاریخی ترتیب قرآن کے ذریعے اس کے حقیقی و بنیادی خط و خال نمایاں کرے تو وہ ناحق کوش اور وہ جو نصوص صریحہ کے خلاف اسراء کو معراج، مشابہ کو مشتبہ، آیات اللہ کو معجزات رسول بتائے وہ حق پرست۔ اس ظلم کے خلاف سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:

گیرم کہ رسم عشق من آوردہ ام بدہر
ظلم آفریدۂ دل ناحق شناس کیست؟ (غالب)

بہرحال وہ نوجوان جو حقیقت اسلام تک پہنچنے کا تھوڑا سا وقت نکال سکتے ہیں انھیں "مختصر سیرت سیدنا محمد صلعم" پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کے غیر تاریخی مطالعہ نے اسلام پر کیسے کیسے حجابات ڈال دئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اخلاقیات و سیاسیات کا رشتہ کن کن مدارج سے گزر کر استوار ہوتا ہے، اور وہ یہ بھی معلوم کرلیں گے کہ جمہوریت افراد قوم کی کثرت رائے کی حکومت کو نہیں کہتے بلکہ یہ اصول کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہے۔ اسی کو قرآن نے کتابی آمریت (اصول کی ڈکٹیٹر شپ) کہا ہے اور اسلام، طاعتِ الٰہی یا صراطِ مستقیم ہے، جو دین و دنیا، سائنس اور وحی، منطق اور محسوسات یعنی عقل و دل کے تضاد کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے سامنے دین کا یہ روشن پہلو نمایاں ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ لاالٰہ کی نفی میں لادینیت کے توہمات کا انکار اور اِلّا اللہ کے اثبات میں دین کے حقائق کے اقرار کو پا جائیں گے۔

حاصل کلام

مسلمانوں کے انتشار فکر و عمل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن حکیم اور عمل رسول کریمؐ متضاد تصورات کی وجہ سے ناقابل فہم بن گئے ہیں۔ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔
اس انتشار کو دور کر کے صحیح فکر و عمل پیدا کرنے کے لیئے ہر ملک میں ایسے مفکرین کی ضرورت ہے جو قرآن وسیرت کا تاریخی ترتیب کے ساتھ ساتھ مطالعہ کریں اور حقیقت اسلام کو اپنی قومی زبانوں میں عامۃ الناس کے سامنے لائیں۔

اس سلسلے میں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی

(۱) ہر ملک کے علماء ایک بیت الحکمہ قائم کریں، اور تاریخ عالم کے نقشے میں افکار انسانی کی صحیح جگہ کو دیکھیں۔ پھر اپنے قومی موقف کو خواہ وہ ذہنی ہو یا مادی، دوسری قوموں کے افکار و اعمال کے مقابلے میں جانچیں۔ اسے ہم "پس منظر اسلام" کہہ سکتے ہیں۔

(۲) قرآن کی مختلف سورتوں (اور جہاں ضرورت ہو رکوعوں) کو تاریخی ترتیب سے مرتب کریں اور ہر سورہ (یا رکوع) کے سامنے یہ نوٹ کر دیں کہ اس کے نزول کے وقت آنحضرتؐ کا روئے سخن کس قوم کی طرف تھا، اس کی پچھلی تاریخ کیا تھی، اور نزول کے وقت وہ کن کن تاریخی و معاشی احوال سے گزر رہے تھے۔

(۳) آخر میں مندرجہ بالا تاریخ اقوام اور ترتیب قرآن کی روشنی میں ایک سیرت نبوی مرتب کرلیں۔ جس کے ذریعے سے وہ ظاہر کریں کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے حضرت محمد عربیؐ کی رسالت تک اور آپؐ کے بعد متممین رسالتؐ کی خلافت تک فکر و عمل اسلام کی کیا نوعیت رہی۔ اسے کس طرح ترقی دی گئی۔ اور کس طرح یہ روشنی مختلف اقوام میں انقلاب برپا کرتی رہی، اور کرتی رہے گی۔

عربی فارسی جاننے والوں کو امام ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات سے کافی روشنی مل سکتی ہے۔

اسلام کا اصلی ماخذ قرآن ہے

مطبوعات
بیت الحکمت
دھلی
(ھند)

پس منظر اسلام۔ چار حصوں میں

۱۔ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت

۲۔ اسلام سے پہلے عرب کی حالت

۳۔ مقدمہ سیرت سیدنا محمد صلعم

۴۔ حیات محمدی قبل بعثت

۴۔ اعلانِ انقلاب

سورۃ العلق کا مفہوم

یعنی

فلسفۂ وجود اور فلسفۂ علم کی بحث کے

بعد اسلام کی بنیادی تعلیم کا خلاصہ

اُن نوجوان طلبہ کے نام
جو

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال کا تاریخی ترتیب قرآن

اور تاریخ تمدن انسانی کی روشنی میں مطالعہ کر کے

اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں

اور

یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ فکر و عمل اسلام کی تعبیر میں

کیوں علمائے اسلام متفق الرائے نہیں

ارا کین بیت الحکمت، دہلی (ہند)

۲۔ ترتیب نزول قرآن کریم

احادیث کی مدد اور خود قرآن کے داخلی مطالعہ کے بعد قرآن کی مختلف سورتوں اور رکوعوں اور پھر آیتوں کی ترتیب تنزیلی بتائی گئی ہے اسکے علاوہ اس سے پہلے کی تحقیقات بھی درج کر دی گئی ہیں۔

۵۔ پیمان انقلاب

مفہوم سورۃ الحمد جس میں ہندوستان کے چوبیس اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ترتیب تنزیلی کے بغیر قرآن کریم کا مطالعہ آسان نہیں ہے۔

۳۔ مشکلات قرآن کا انقلابی حل

تفسیر نے جو مشکلات فہم قرآن میں پیدا کر دی ہیں، ان کا انقلابی حل، ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں۔

سول ایجنٹ

سنگم کتاب گھر

اُردو بازار

دہلی

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب نزول قرآن کے مطابق فکر محمدی اور قرآن کے ساتھ ساتھ عمل نبوی کو پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے نمایاں کیا گیا ہے۔

سیرتِ قرآنیہ سیّدِنا محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم

لقد یسّرنا القرآن الذکر فھل من مدکر؟

بادشاہی اور جاگیرداری دور ختم ہو رہا تھا۔ جمہوری اور مشینی دور کی ابتدا تھی اس وقت امام ولی اللہؒ محدث دہلوی نے قرآن کی انقلابی روح کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ارباب حکومت اور امراء کے لئے تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ کی حکمت، عقل، نقل اور کشف کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے تفسیر فتح الرحمان سے پہلے اسے اور المسوّی کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ متوسط طبقہ کے لئے شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹) نے تفسیر فتح الرحمان کے اصول کی تشریح کے لئے فتح العزیز لکھی اور جماعت مجاہدین تیار کی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو قرآن و حدیث کا درس دیا۔ انہوں نے قرآن کو امت مسلمہ کے عام لوگوں کی ہندی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ وہ قرآنی دعوتِ انقلاب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیو بندی تھے۔

قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سیرت نبوی کے سلسلے میں اس کے تاریخی ادوار متعین کر لئے جائیں اور تاریخ تمدن انسانی کے پس منظر میں اسے اپنی اپنی زبان میں سمجھا جائے۔ اردو میں اس قسم کی سیرت مکتبہ بیت الحکمت دہلی سے مل سکتی ہے۔ اسے "بیت الحکمت ہند" نے بیس زبانوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس سیرت میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمونہ "پیغام انقلاب" ہے۔ اس طرح سیرت کے قرآنی مطالعہ سے متعدد غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور حکمت قرآنیہ فکر انسانی سے بہت قریب آجاتی ہے۔ قیمت قسم اول چار روپے، قسم دوم تین روپے آٹھ آنے

سول ایجنٹ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی

Allama Iqbal Library
19210
19210

Title اعلان انقلاب
Author محمد اجمل خان
Accession No. ۱۹۳۱۰
Call No. ۲۹۷٫۱۴ ۱۲۷۸م

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

The Jammu & Kashmir University Library, Srinagar.

1. Overdue charge of *one anna* per-day will be charged for each volume kept after the due date.

2. Borrowers will be held responsible for any damage done to the book while in their possessio

THE JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY.

DATE LOANED

Class No. [illegible] Book No. [illegible]

Vol. ____ Copy ____

Accession No. ۱۹۴۱۰

7/11/67

28/10/67